ثروت خان کے ناول "اندھیرا پگ" میں
راجستھانی تہذیب و ثقافت

تحقیقی مقالہ برائے (ایم۔فل اردو)

مقالہ نگار

محمد حسن

ایم۔فل (اردو)

رول نمبر: 121

نگرانِ مقالہ

ڈاکٹر منصور احمد قریشی

صدر شعبۂ اردو

انسٹی ٹیوٹ آف سدرن پنجاب، ملتان

رجسٹریشن نمبر: MPU-021R20P-121

سیشن: 2020-2022ء

(مقالہ ہذا کی منظوری بورڈ آف ایڈوانس سٹڈیز اینڈ ریسرچ کے اجلاس منعقدہ یکم جون 2021ء میں دی گئی)

شعبۂ اردو

انسٹی ٹیوٹ آف سدرن پنجاب، ملتان

(حلف نامہ)

میں حلفاً اقرار کرتا ہوں کہ زیرِ نظر تحقیقی مقالہ بعنوان **"ثروت خان کے ناول "اندھیرا پگ" میں راجستھانی تہذیب و ثقافت"** میری ذاتی کاوش اور محنت کا ثمر ہے۔ میرے علم کے مطابق اس عنوان کے تحت یہ مقالہ پاکستان کی کسی یونیورسٹی میں کسی بھی ڈگری کے حصول کے لئے اس سے قبل پیش نہیں کیا گیا۔

مقالہ نگار

محمد حسن

رول نمبر:121

(سرٹیفکیٹ)

میں اس امر کی تصدیق کرتا ہوں کہ محمد حسن، رول نمبر 121 (ایم۔فل اردو) نے میری نگرانی میں تحقیقی مقالہ بعنوان **"ثروت خان کے ناول "اندھیرا پگ" میں راجستھانی تہذیب و ثقافت"** تحریر کیا ہے۔ میں مقالہ کے معیار اور مقالہ نگار کے کام سے مطمئن ہوں اور اس امر کی اجازت دی جاتی ہے کہ یہ مقالہ ایم۔فل (اردو) کی ڈگری کے حصول کے لیے جمع کروایا جائے۔

نگران مقالہ

ڈاکٹر منصور احمد قریشی

صدر شعبہ اُردو

انسٹی ٹیوٹ آف سدرن پنجاب، ملتان

انتساب!

والدہ صاحبہ کے نام

یہ ایسا قرض ہے جو میں ادا کر ہی نہیں سکتا

میں جب تک گھر نہ لوٹوں میری ماں سجدے میں رہتی ہے

(منور رانا)

فہرست ابواب

پیش لفظ !	vii
باب اول: **تہذیب کیا ہے؟**	1
باب دوم: **راجستھانی تہذیب وثقافت کا جائزہ**	37
باب سوم: **ناول ''اندھیرا پگ'' کا تہذیبی وثقافتی تناظر میں جائزہ**	70
باب چہارم: **ناول ''اندھیرا پگ'' میں خواتین کے سماجی مسائل کا جائزہ**	121
باب پنجم: **محاکمہ**	157
کتابیات	164

پیش لفظ

ناول اردو ادب میں ایک اہم نثری صنف کے طور پر معروف ہے۔اردو میں ناول نگاری کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آج ناول اپنے اسلوب اور ادبی روایت کے تناظر میں مستحکم حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ کئی ناولوں کی ڈرامائی تشکیل اِسے شہرت کی بلندیوں تک پہنچا چکی ہے۔ مرزا ہادی رسوا، عبدالحلیم شرر، کرشن چندر، پریم چند، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، رضیہ فصیح احمد، عبداللہ حسین، اے آر خاتون، نسیم حجازی، شوکت صدیقی، انور سجاد، ایم اسلم، انیس ناگی، انتظار حسین، بانو قدسیہ، مستنصر حسین تارڑ، خالدہ حسین جیسے مشاہیر ناول نگاری کی فہرست میں اپنے اُسلوب کی ندرت، بیان کی روانی اور تخیّل کی فراوانی کے سبب منفرد اہمیت کے حامل قرار پائے۔

جب کوئی ادیب اپنی ذہنی و فکری صلاحیتیں بروئے کار لا کر فن پارہ تخلیق کرتا ہے تو اسے خبر تک نہیں ہوتی کہ اس کی تخلیق دنیائے ادب پر کیا اثرات مرتب کرے گی۔ دنیا کے گلوبل ویلج میں تبدیل ہونے سے ذہنی اور فکری فاصلے یکسر معدوم ہو کر رہ گئے ہیں۔ تخلیق کار کا کام صرف لفظ گھڑنا نہیں ہوتا، اس کا منصب اس سب سے کہیں بلند ہے۔ ایک اچھی تخلیق فرد اور معاشرے دونوں پہ مثبت اثرات مرتب کرتی ہے۔ اس مقالے کا موضوع بھی انھی احساسات و جذبات کے زیرِ اثر منتخب کیا گیا ہے۔

راجستھانی تہذیب و تمدن کی معاشرت، سیاست، معیشت اور ثقافت کو ثروت خان نے اپنے ناول "اندھیرا پگ" کے پس منظر کے طور پر چُنا ہے۔ ثروت خان جو اردو ادب میں قدرے نیا

نام ہے۔ انھوں نے اپنے تدریسی فرائض کے ساتھ ساتھ دیہاتوں میں عورتوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا۔ "اندھیرا پگ "ناول راجستھان کی عورت کی کانٹوں بھری زندگی کا بیانیہ ہے۔ یہ عورت تعلیم جیسے بنیادی حق سے محروم تو ہے ہی۔۔اس کے ساتھ ساتھ اسے کم عمری میں، اس کی مرضی کے خلاف بیاہ دیا جاتا ہے جہاں سے اور کئی مسائل جنم لیتے ہیں۔ ناول میں خصوصیت سے "بیوہ" کی زندگی کو موضوع بنا کر اس کے الم بیان کیے گئے ہیں۔

"ناول اندھیرا پگ میں راجستھانی تہذیب کا جائزہ" میں نے اس مقالے کا پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب "تہذیب کیا ہے ؟" کے بنیادی مباحث پر مبنی ہے۔ تہذیب کا ارتقاء، تہذیب، ثقافت اور کلچر کا فرق، اور دنیا کی قدیم تہذیبیں اس کی ذیلی سرخیاں ہیں۔ دوسرے باب میں راجستھانی تہذیب کا خصوصیت سے جائزہ لیا گیا ہے۔ راجستھان میں ادب کا ارتقاء کب اور کیسے ہوا؟ اور تہذیب و ثقافت کے ادب پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، اس کو تفصیلا" بیان کیا گیا ہے۔ باب سوم ناول "اندھیرا پگ "کا تہذیبی و ثقافتی تناظر میں جائزے پر مشتمل ہے۔ ناول کا فن، راجستھان میں ناول کی روایت، ناول اندھیرا پگ کا کرداری مطالعہ، اس کے ذیلی عنوانات ہیں۔

چوتھا باب "اندھیرا پگ میں خواتین کے سماجی مسائل کا جائزہ" کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے۔ عورت مختلف تہذیبوں کے تناظر میں، اردو ناول میں تانیثیت، اور اندھیرا پگ میں اجاگر کیے گئے مسائل اس کے ذیلی مباحث ہیں۔ پانچواں اور آخری باب محاکمہ پر مشتمل ہے جس میں مجموعی طور پر جائزہ لیا گیا ہے۔

میں ذاتِ باری تعالٰی کا بے حد شکر گزار ہوں کہ جس کی رحمت اور کرم سے میں تحقیق کے اس کٹھن سفر میں کامیاب ہوا۔ اللہ رب العزت نے میرے لیے مقالے کی تکمیل کے دوران

آسانیاں پیدا کیں۔ مزید کامیابیوں کے لیے دعا گو ہوں۔ ماں کی دعا اور باپ کا سایہ جسے میسر ہو اسے بھلا کس چیز کا غم۔۔۔ میرے والدین نے ہر مقام پر میرے لیے دعا کی اور حوصلہ افزائی کی۔ مجھ میں حوصلہ، ہمت اور خود اعتمادی میرے والدین کی عطا کردہ سوغات ہے۔ حصولِ علم میں انھوں نے ہمیشہ دامے، درمے، سخنے، قدمے میرا ساتھ دیا ہے۔ اپنے والدین کی محبت کا میرا رُواں رُواں قرض دار ہے۔

استاد کو روحانی باپ کہا گیا ہے۔ والدین، انسان کو زمین پر لانے کا سبب بنتے ہیں جب کہ استاد علم و عرفان کی دولت سے مالا مال کر کے اسے بلندیوں پر لے جاتا ہے۔ ایسے ہی خوش اخلاق، قابل اور شفیق شخصیت منصور احمد قریشی صاحب (صدر شعبہ اردو آئی ایس پی ملتان) مجھے نگران مقالہ اور استاد کی صورت میں ملی جن کی نگرانی میرے لیے سنگ میل ثابت ہوئی۔ میری وقت بے وقت کی حاضری کو انھوں نے کبھی محسوس نہ کیا۔ میری خامیوں اور کجیوں کو انھوں نے اپنی پیار بھری ڈانٹ سے سنوارا جس کے نتیجے میں، میں اپنے تحقیقی امور سے بہ طریقِ احسن نبرد آزما ہو پایا۔ اللہ ان کی تبحرِّ علمی کو سلامت رکھے۔ (آمین)

میں گورنمنٹ کالج میاں چنوں کے صدرِ شعبہ اردو، مہر مقدر حسین سپرا کا دل سے ممنون ہوں جنھوں نے ہر ممکن مدد کی اور کتب تک رسائی ممکن بنائی۔ مجھے شکریہ ادا کرنا ہے عائشہ وڑائچ کا جن کی رہنمائی اور شفقت کے باعث میں یہ مقالہ مکمل کر پایا تاریخی حوالوں کے لیے رہنمائی اور نایاب مجوزہ کتب اور مقالات تک رسائی انھی کی وجہ سے ممکن ہو پائی۔ "ادبیات" گروپ کی بدولت یہ ممکن ہو پایا۔ میں احسان مند ہوں فرحان چاون کا اور سی آر ملک ادریس کا جن کی بدولت

میری راہیں آسان سے آسان تر ہوتی چلی گئیں۔ان کے تعاون، رہنمائی اور محبت کے لیے میں دل سے شکر گزار ہوں۔

میم دل نشاط صاحبہ جو اردو ادب میں منفرد نام اور مقام رکھتی ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ مجھے خوش آمدید کہا اور میرے لیے مقالے کے معاملات میں آسانیاں پیدا کیں۔

اپنے پیارے دوستوں اور اپنی کلاس کے طلباء کا دل سے سپاس گزار ہوں کہ جن کی دعاؤں اور حوصلہ افزائی کے باعث آج میں اپنے مقالے کو مکمل کر پایا۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ سب کو کئی گنا جزائے خیر عطا کرے۔(آمین)

آخر میں اس مقالہ کی کمپوزنگ کے لیے ارشد عباس ذکی کے لیے نیک خواہشات کہ انہوں نے اس مقالہ کی کمپوزنگ کو بروقت مکمل کیا۔

محمد حسن

ایم۔فل (اردو)

رول نمبر: 121

باب اول

تہذیب کیا ہے؟

1۔ تہذیب کیا ہے؟

اپنی بقا کے لیے فطرت کے مقابل انسان کی تگ ودو روزِ اول سے جاری ہے۔ فطرت کے مقابل بقا کی اس جنگ میں انسان ہمیشہ عدم تحفظ اور شدید احساس کمتری کا شکار رہا ہے۔ یہی وہ خوف ہے جو غاروں کے عہد سے لے کر آج سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور تک انسان کے متضاد سفر کرتا رہا ہے۔ ترقی کی خواہش نے انسان کو فطرت کی تسخیر پر اکسایا۔انسان نے اپنے وجود کو اَساس مانتے ہوئے اپنے موجود کی تراش خراش کی، اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھایا اور تہذیب و تمدن کی بنیاد رکھی۔ یہ بنیاد کہیں مذہب پر رکھی گئی اور کہیں زبان وبیان اس کا پیش خیمہ ٹھہرے۔ تاریخ کے اوراق میں ہمارے لیے مختلف تہذیبیں ایسی زندہ روایات کے ساتھ ہمیں مطالعہ کی دعوت دے رہی ہیں۔

ہر قوم کی اپنی ایک تہذیبی شخصیت ہوتی ہے۔ کسی شخصیت کے بعض پہلو دوسری تہذیبوں سے ملتے جلتے ہیں لیکن بعض ایسی انفرادی خصوصیات بھی ہوتی ہیں جو ایک قوم کو دوسری قوم سے الگ کرتی ہیں۔ اپنی زندگی کو سہل خوشگوار اور ارد گرد کے ماحول سے ہم آہنگ کرنا انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔

انسان ایک سماجی مخلوق ہے۔اِسے دنیا میں ایک طرف تو اپنی معاشی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے وسائل کی ضرورت تھی جبکہ دوسری طرف اپنے ہی جیسے دوسرے جانداروں کے ساتھ رشتے معاملات اور پیشہ ورانہ ضروریات کے لئے تعلقات میں فروغ لانا تھا تاکہ ترقی کی طرف قدم بڑھایا جا سکے۔

اپنی ہستی کا تحفظ جبلی طور پر ہر جاندار میں موجود ہوتا ہے۔ اسی کے پیشِ نظر انسان نے آلات و اوزار پیدا کیے۔ سماجی ضروریات اور اختلاط وارتباط اور تجربات کی اہمیت کے پیشِ نظر وسیلہ اظہار کے لیے زبان کو ایجاد کیا۔ اس عالمِ رنگ و بو میں انسانی تہذیب اور اس کا ارتقاء انسانی تاریخ سے عبارت ہے۔ تہذیب ہی انسانی زندگی کی پیدائش سے اس کے ساتھ ساتھ چلتی اور اسے سنوارتی اور نکھارتی ہے۔ تہذیب انسان کو شناخت عطا کرتی ہے۔

انسانی تاریخ دراصل تہذیبوں کی تاریخ ہے اور تہذیبوں کی کہانی نسلوں پر محیط ہے۔ انسانی زندگی تہذیب سے پہلے آزاد اور منتشر تھی۔ ایک ایسی زندگی جس میں انسان محض اپنی ذات کی بقا، تحفظ اور ارتقاء کے لیے پیدائش سے موت تک کے فاصلے کو طے کرتا ہے۔ جس میں نہ کسی ضابطے کی پاسداری ہے نہ عمل کی پابندی، بس زندگی کی شروعات فطرت کے اصولوں کے مطابق ہوئی جیسا کہ تمام جاندار پیدا ہوتے ہی پروان چڑھتے ہیں ان کا یہ ارتقائی سلسلہ موت تک جاری رہتا ہے۔ سب جاندار کچھ مشترکہ خصوصیات لے کر اس دنیا میں آتے ہیں جیسا کہ تمام جاندار بغیر ستر کے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ فطرت کا مقررہ ضابطہ ہے۔ سب جاندار سانس لیتے ہیں، خوراک استعمال کرتے ہیں اور بتدریج نشوونما پاتے ہیں۔ ان میں سے بعض تیزی سے پروان چڑھتے ہیں اور بعض کی بڑھوتری کا عمل سست ہوتا ہے۔ اگر جانداروں کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو ہم پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان ہی وہ واحد مخلوق ہے جو اپنی ابتدائی شکل سے لے کر آج تک اپنی عقل و خِرد اور شعور سے کام لے کر اپنی زندگی کو بدلنے کی قدرتی صلاحیت رکھتا ہے۔ باقی جاندار ایسی انقلابی تبدیلیوں سے محروم رہے ہیں۔ انسان ہی وہ واحد مخلوق ہے جس نے مظاہرِ فطرت کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال کر اپنے لئے فلاح و بہبود کی راہیں ہموار کیں۔ انسان اس منزل پر ایک ہی جست میں نہیں پہنچا بلکہ لاکھوں کروڑوں سالوں کے بعد انسان نے دائرۂ تہذیب میں قدم رکھا۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر تہذیب کیا ہے؟ تہذیب کے معنی کیا ہیں؟

ثقافت کا اس کے ساتھ کیا رشتہ ہے؟ کلچر کا نام ان دونوں اصطلاحوں کے ساتھ کیوں لیا جاتا ہے؟ اور انسانی زندگی میں ان کی ضرورت اور اہمیت کیا ہے؟

تہذیب، ثقافت اور کلچر:

عربی لفظ تہذیب کا مادہ "ہ ذ ب" ہے جبکہ عربی میں اس کے لغوی معنی پاکیزہ کرنا، شاخ تراشنا، اصلاح کرنا، یا درست کرنا کے ہیں (1)۔ نور اللغات میں تہذیب کے معنی پاک کرنا، اصلاح کرنا، آراستگی، پاکیزگی، شائستگی ہے (2)۔

لفظ تہذیب کا مترادف یا ہم معنی سمجھا جانے والا لفظ ثقافت ہے۔ ثقافت بھی عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مادہ "ثَ، قَ، فَ" ہے۔ اس کا مطلب ہے زِیرکی، دانائی وغیرہ۔ قرآن پاک میں لفظ ثقافت کا مفہوم "پانا" یا "تلاش" کرنا کے ہیں۔ انگریزی زبان میں ثقافت کے لیے کلچر (culture) کا لفظ رائج ہے۔(3)

''فرہنگِ کارواں'' میں ثقافت کے درج ذیل معنی ہیں:

> "ثقافت کے معنی: فنون لطیفہ علم وادب، تمدن اور کسی قوم کا تصور حیات"(4)

یہ کائنات ایک معمہ ہے لیکن جب انسان نے کائنات کی ابتدا پر غور و فکر کیا تو اس کے سامنے تہذیبوں کے آثار کی صورت میں وہ اعلیٰ نمونے سامنے آئے جن پر بجا طور پر وہ فخر کر سکتا تھا۔ تہذیب کی ابتدا، اس کا ارتقاء اور دنیا کی قدیم تہذیبوں کے بارے میں تفصیلی جائزے سے پہلے ضروری ہے کہ ہمیں علم ہو کہ تہذیب و ثقافت، کلچر دراصل ہیں کیا؟ ان تینوں الفاظ کی سبطِ حسن نے اپنی تصانیف "پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء" میں یوں تعریف کرتے ہیں:

"انگریزی زبان میں تہذیب کے لیے کلچر کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ کلچر لاطینی زبان کا لفظ ہے اس کے لغوی معنی زراعت، شہد کی مکھیوں، ریشم کے کیڑے، بیکٹیریا کی پرورش یا افزائش کرنا، جسمانی یا ذہنی اصلاح و ترقی، کھیتی باڑی کرنا۔ تہذیب عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی کسی درخت یا پودے کو کاٹنا چھاٹنا، تراشنا تاکہ اس میں سے نئی شاخیں نکلیں اور نئی کونپلیں پھوٹیں۔ فارسی میں تہذیب کے معنی آراستن، پراستن، پاک و درست، اصلاح نمودن ہیں۔ اردو زبان میں تہذیب کا لفظ عام طور پر شائستگی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے"(5)

تہذیب یا کلچر کی اصطلاح مبہم اور مختلف المعنی ہے جس کے مختلف ادوار، زبانوں، ممالک اور علاقوں میں جدا جدا مفہوم ہیں۔

"آکسفورڈ ڈکشنری" کے مطابق:

"Culture the customs and beliefs our way of life and social organization of particular country or group" (6)

جیسا کہ مندرجہ بالا اقتباس میں بتایا کہ انگریزی میں کلچر لفظ بطور اصطلاح کے استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں اس کے لئے تہذیب اور ثقافت دونوں مستعمل ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے انگریزی لفظ سیویلائزیشن کے لئے اردو میں تمدن کے ساتھ تہذیب اور ثقافت کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تہذیب اور ثقافت کی معنوی تقسیم کرتے ہوئے یوں وضاحت کی ہے:

"لغات میں جن معنی میں یہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ان سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ لفظ تہذیب کا زور خارجی چیزوں اور طرز عمل کے اس

اظہار پر ہے جس میں خوش اخلاقی اطوار، گفتار اور کردار شامل ہیں اور لفظ ثقافت کا زور ذہنی ثقافت پر ہے جن میں علوم و فنون میں مہارت حاصل کرنا اور ترقی دینے کی صفات شامل ہیں۔ میں نے لفظ تہذیب اور ثقافت کے معنی یکجا کر کے ان کے لئے ایک لفظ کلچر استعمال کیا ہے جس میں تہذیب اور ثقافت دونوں کے مفہوم شامل ہیں۔اس کے معنی یہ ہوئے کہ کلچر ایک ایسا لفظ ہے جو زندگی کی ساری سرگرمیوں کا خواہ وہ ذہنی ہوں یا مادی، خارجی ہوں یا داخلی احاطہ کر لیتا ہے۔"(7)

جیسے انگریزی اصطلاح کلچر کے لیے اردو میں "تہذیب اور ثقافت" استعمال کیے جاتے ہیں ویسے ہی سیویلائزیشن کے لیے بھی اردو میں "تمدن اور تہذیب" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ تمدن اور تہذیب میں نمایاں فرق محض حجم کا ہے یعنی "تمدن" تہذیبوں کے مقابلے میں بڑے اور پیچیدہ ہوتے ہیں۔ ان میں وہ ساری سرگرمیاں نسبتاً بڑے پیمانے پر انجام دی جاتی ہیں جو تہذیب کا حصہ ہوتی ہیں۔ تہذیب اور ثقافت دونوں افراد کے مجموعی طرزِ حیات کو بیان کرتے ہیں۔ایک تہذیب وسیع تناظر میں ثقافت ہوتی ہے۔ان دونوں میں اقدار، معیار، ادارے، روایات اور افکار شامل ہوتے ہیں جن کو کسی بھی معاشرے میں نسلیں متواتر اس دور میں اہمیت دیتی ہیں۔

تہذیب کے موضوع پر انگریزی مصنف تاریخ دان اور فلاسفر ول ڈیورنٹ کی کتاب "دی سٹوری آف سیویلائزیشن" بین الاقوامی شہرت کی حامل کتاب ہے۔ ول ڈیورنٹ کے ہاں تہذیب اور کلچر کی اصطلاحات جن مفہوم کی حامل ہیں اس کے مطابق:

"کلچر زراعت کا تقاضہ کرتا ہے جبکہ تہذیب شہر کا۔ ایک پہلو سے تہذیب شائستگی کا لباس ہے اور شائستگی وہ نفاست ہے جو شہر میں بسنے

> والوں نے صرف شہر میں ہی ممکن سمجھی کیونکہ دولت اور ذہانت جو دیہی
> علاقوں میں پیدا ہوتی ہے شہری علاقوں میں جمع ہو جاتی ہے۔ شہروں میں
> کچھ لوگ مادی کاروبار سے علیحدہ ہو کر سائنس فلسفہ ادب اور آرٹ
> تخلیق کرتے ہیں۔ تہذیب کسانوں کے جھونپڑوں سے شروع ہوتی ہے
> لیکن اس کی افزائش شہروں میں ہوتی ہے۔"(8)

اردو ادب میں صاحب علم وفنون کے ذہنوں میں انیسویں صدی تک تہذیب کا وہی تصور تھا جو فارسی زبان میں رائج تھا۔ سر سید احمد خان اردو کے پہلے دانشور ہیں جنہوں نے تہذیب کا وہ مفہوم پیش کیا جو انیسویں صدی میں مغرب میں رائج تھا۔ گو انہوں نے تہذیب اور سیویلائزیشن کو ایک ہی معنی میں استعمال کیا مگر ساتھ ہی انہوں نے تہذیب کی جامع تعریف کی اور اس کے عناصر اور عوامل کا جائزہ لیا۔ تہذیب کی تعریف کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> "جب ایک گروہ انسانوں کا کسی جگہ اکٹھا ہو کر بستا ہے تو اکثر ان کی
> ضرورتیں اور ان کی حاجتیں، ان کی غذائیں اور ان کی پوشاکیں، ان کی
> معلومات اور ان کے خیالات، ان کی مسرت کی باتیں اور ان کی نفرت کی
> چیزیں سب یکساں ہوتی ہیں اور اسی لئے برائی اور اچھائی کے خیالات بھی
> ایک جیسے ہوتے ہیں اور برائی کو اچھائی سے تبدیل کرنے کی خواہش سب
> میں ایک سی ہوتی ہے اور یہی مجموعی خواہش تبادلہ یا مجموعی خواہش سے وہ
> تبادلہ اس قوم یا گروہ کی سیویلائزیشن ہے"(9)

سر سید احمد خان کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس لفظ کو وسعت دی۔ ان کے بعد اردو ادب میں یہ لفظ محدود معنوں کے بجائے وسیع معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ تہذیب، ثقافتی تخلیق کے فروغ کا موجب ہے۔ معاشی بہم رسائی، سیاسی تنظیم، اخلاقی روایات اور علم و فن کی جستجو۔

ڈاکٹر ملک حسن اختر اپنی کتاب "تہذیب و تحقیق" میں رقم طراز ہیں:

> "اگر ہم تہذیب کو مختصر الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو اسے طرزِ زندگی کا نام دے سکتے ہیں۔ طرزِ زندگی میں لوگوں کا رہن سہن، سوچ، علوم و فنون، معیشت اور سیاست کے اصول، شاعری اور موسیقی، روایات، قدیمی عقائد، زبان اور رسوم شامل ہیں کیونکہ یہ چیزیں ہی طرزِ زندگی کو متعین کرتی ہیں"(10)

مندرجہ بالا تعریفوں کو سامنے رکھا جائے تو بخوبی اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ تہذیب کے تمام مفاہیم اپنی اپنی جگہ درست ہیں کیونکہ تہذیب اخلاقی احساس کے ساتھ ساتھ تربیت یافتہ فطرت کا نام بھی ہے۔ کثافت اور جمود سے بچنے کے لئے لطیف جذبات، احساسات و تاثرات اور افکار میں زندگی بسر کرنا تہذیب ہے۔ رسوم، رواج، روایات، اقدار، زبان و ادب، سماجی روابط، رہن سہن، اخلاق و عادات، معاشرتی تعلقات یہ سب تہذیب کے مظاہر ہیں جن کے بغیر کوئی تہذیب ترقی نہیں کر سکتی۔

2۔ تہذیب کا ارتقاء:

ارتقاء کسی ایک منزل سے دوسری منزل تک پہنچنے کا نام ہے۔ اربوں سال کے اس عمل کو سماجی مقاصد کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس تمام سرگرمی کو ایک بامقصد عمل قرار دینا پڑتا ہے۔ اسی طرح ارتقاء کے حوالے سے دیکھا جائے تو حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے ساتھ ہی تہذیب کا ارتقاء شروع ہو گیا تھا۔ انسان یعنی آدمؑ کی فرشتوں پر فضیلت ہی درحقیقت تہذیب کے ارتقاء کی پہلی کڑی ہے۔ کائنات پر غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ یہ کائنات مسلسل ارتقاء کی منازل طے کرتے ہوئے آج گلوبل ویلیج میں تبدیل ہو گئی ہے۔ تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس کائنات میں کیا تبدیلیاں ہوئیں، آب و ہوا کیسے بدلی، ماحول نے انسانوں، جانوروں، پرندوں اور درختوں کو کس طرح متاثر کیا۔

انسان جب اس کرہ ارض میں آیا اس وقت فطرت چھائی ہوئی تھی۔ ابتدائی دور کا انسان فطرت کے ہاتھوں بہت زیادہ بے بس تھا اس کے باوجود وہ اپنے ذہن و فکر سے اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کے ساتھ نبرد آزمارہ کر مسلسل تہذیبی عمل سے گزر رہا تھا۔ وہ تہذیبی عمل جو حضرت آدمؑ اپنے ساتھ لے کر اس دنیا میں آئے تھے۔ ان کا اس کائنات میں آباد ہونا ہی تہذیبی عمل کی ابتدا تھی۔ پھر نسل آدم کا زمین پر پھیل جانا اور زمین کے مختلف حصوں میں جہاں اس کی ضروریات پوری ہو رہی تھیں وہاں آباد ہونا، سب تہذیبی ارتقاء کی عکاسی کرتا ہے۔ اس تمام عرصے میں انسان ایک دوسرے سے سیکھتے رہے یعنی نسل انسانی اپنے سے پہلے کی نسل کے تجربوں سے سیکھتی رہی اور وہ معلومات آنے والی نسلوں میں منتقل کرتی گئی۔ اس کے نتیجے میں بتدریج علم بڑھتا رہا۔ اس سارے عمل میں زبان نے اہم کردار ادا کیا۔ ابتدا میں دنیا میں ایک ہی زبان تھی۔ تہذیب کے ارتقائی منازل طے کرنے کے ساتھ ساتھ زبان بھی مسلسل ارتقاء کے عمل سے گزرتی رہی۔ ابتدا میں زبان بولنے کی حد تک محدود تھی لیکن جب زبان میں ادب لکھا جانے لگا تو علم کے پھیلاؤ میں آسانی ہو گئی۔ تہذیبی ارتقاء کو سمجھنے کے لئے ماہرین نے اسے مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "ایک وہ زمانہ ہے کہ جب انسان نے لکھنا نہیں سیکھا تھا اس لیے اسے تاریخ سے قبل کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ تاریخ کے اس حصے میں قدیم پتھر کا زمانہ، درمیانی پتھر کا زمانہ اور جدید پتھر کا زمانہ آتا ہے۔ اس زمانے کی معلومات کی بنیاد آثارِ قدیمہ کی کھدائیوں پر ہے۔ اس کے بعد کا عہد کانسی کا ہے جس میں تہذیب کی ابتدا ہوتی ہے۔ مختلف تہذیبوں میں رسم الخط شروع ہو چکا تھا تحریر کی وجہ سے اس زمانے کے لوگوں کے رہن سہن، عادات، رہائش، تجارت اور رسم و رواج کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔"
>
> (11)

یوں تہذیب مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے کانسی کے زمانے تک ترقی یافتہ ہو گئی تھی۔ اس کی بنیادی وجہ علم کا شعور اور پھیلاؤ تھا۔ کانسی کے زمانے کے بعد لوہے کا زمانہ ہے جسے جدید تہذیب کا زمانہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس زمانے میں انسان سائنسی اعتبار سے بہت ترقی کر چکا تھا۔ لوہے کی دریافت کے بعد انسان تہذیب کے اعلیٰ مقام تک پہنچا۔

زمانہ پتھر کا ہو، کانسی کا، یا لوہے کا، ہر زمانے میں انسان گروہوں کی شکل میں ہی رہا ہے۔ اکیلے رہنے میں اسے جانی خطرہ تھا۔ مل جل کر رہنے سے وہ ایک دوسرے کی حفاظت کر سکتے تھے۔ غذا کی تلاش میں انہیں ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت تھی۔ وہ گروہ کی صورت میں ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرتے تھے۔ غذا کی تلاش کرتے تھے۔ انسان نہ زراعت سے آشنا تھا اور نہ گلہ بانی کرتا تھا۔ غذا حاصل کرنے کا ذریعہ درخت۔ جڑیں، پھول، کونپلیں اور پتے ہوا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انڈے، مچھلیاں، پرندے وغیرہ بھی غذا کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔

اس طرح انسان کئی تجربات سے گزرا کہ کیا کھانا چاہیے؟ کیا پینا چاہیے؟ کونسا پودا نقصان دہ ہے؟ کون سا پھل فائدہ مند ہے؟ پرندوں کے انڈے کہاں سے ملیں گے؟ غذا حاصل کرنے کا اگلا مرحلہ شکار کا تھا۔ لوگ گروہوں کی صورت میں شکار کرتے تھے۔ ابتداًان کے پاس ہتھیار اور اوزار نہ تھے اس لیے لوگ مل کر جانوروں کو پکڑتے اور آپس میں بانٹ کر کھاتے تھے۔ گوشت کے استعمال کے بعد انسان نے غور و فکر شروع کیا تو اس کے ذہن میں پتھر کے اوزار اور ہتھیار بنانے کا خیال آیا۔

پتھر کے زمانے کے لوگ سردی، گرمی اور موسمی آفات و بلیات سے بچنے کے لئے غاروں اور چٹانوں میں پناہ لیتے تھے۔ یہ خانہ بدوش تہذیبیں اپنا کوئی نشان نہ چھوڑ سکیں۔ وہ اپنے ساتھ ضروریات کی چیزیں رکھتے تھے اس لئے ان کے ہاں ایجادات نہیں ہوئیں۔ ان کی تہذیبیں محدود تھیں کیونکہ ان کا رشتہ کسی ایک زمین سے نہیں ہوتا تھا اس لئے ان کی تہذیبیں بھی محدود ہوتی تھیں اور ان کے تجربات بھی کم

ہوتے تھے۔ ان کا واسطہ زیادہ تر جانوروں اور فطرت سے ہوتا تھا اس لیے اس زمانے کے بارے میں معلومات بہت کم ہیں۔

وہ لوگ ایسی جگہوں پر زیادہ رہتے تھے جہاں انہیں آسانی سے پتھر مل جایا کرتے تھے تاکہ وہ ان سے اوزار اور ہتھیار بنا سکیں۔ اگر اوزاروں اور ہتھیاروں کی ایجادات کے بارے میں غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ کسی ایک اوزار اور ہتھیار کی ایجاد انسان کا تجربہ اور اس کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ جب بھی انسان نے نئے اوزار بنائے یا ان میں تبدیلی کی تو اس کے نتیجے میں معاشرتی سطح پر بھی تبدیلی آئی اور ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ابتداء میں انسان نے اپنے ہاتھوں کو بطور ہتھیار استعمال کیا۔ جیسے اس کا تجربہ بڑھا اس نے ارد گرد کے ماحول پر غور کیا تو اسے پتھر، لکڑی اور درختوں کی شاخیں نظر آئیں جس سے اس نے اپنی حفاظت کی۔ انسان نے پتھروں کو توڑ کر انہیں اوزار کی شکل دی۔

اوزاروں کو بنانے میں اس وقت تبدیلی آئی جب انسان سبزی خوری سے شکار کی طرف آیا تو شکار کے لئے اس نے لکڑی کاٹ کر، گھس کر اسے تیز اور نوکیلا بنایا۔ ان اوزاروں نے انسان کے ہاتھوں کو ایک نئی طاقت دی۔ ان اوزاروں کی مدد سے انسان توڑنے، کاٹنے اور ٹکڑے کرنے لگا۔ اس طرح ان اوزاروں مییں ایک اضافہ ہڈیوں کے اوزاروں نے بھی کیا۔ جانوروں کا شکار کر کے گوشت کھا لیا جاتا تھا مگر ان کی ہڈیاں بچ جاتی تھیں۔ انسان نوکیلے پتھر اور ہڈیوں کی وجہ سے نیزہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ ساتھ ہی ساتھ آپس کے میل ملاپ نے زبان کو ترقی دی۔ زبان جو محض کچھ الفاظ تک محدود تھی اس میں نسلوں کے تجربات جمع ہونے لگے جو آنے والی نسلوں کو منتقل ہو جاتے تھے۔ یوں اس دور سے ہی کہانیاں ،داستانیں اور گیت، مختلف بولی جانے والی زبانوں میں ابھرنے لگے۔ اس نے لوگوں کے میل ملاپ کو اور بڑھایا اور ایک زبان بولنے والے ایک دوسرے کے اور زیادہ قریب ہوتے گئے۔

قدیم پتھر کے زمانے میں لوگوں کی سب سے اہم دریافت آگ تھی۔ آگ کی وجہ سے انسان تہذیبی ارتقاء کے ایک نئے دور میں داخل ہوا۔ آگ کی وجہ سے رات کے اندھیرے میں روشنی نے انسان کو تاریکی اور خوف کے ڈر سے نجات دی۔ سردی کے موسم میں اس آگ کی گرمی نے اس کو راحت دی۔ آگ کے ڈر سے جنگلی جانور دور ہو جاتے تھے۔ آگ کی دریافت نے انسان کی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں لائیں۔ قیاس ہے کہ رات کو آگ کا الاؤ لوگوں کے جمع ہونے کا مرکز ہوتا ہوگا جہاں وہ دن بھر کی روداد ایک دوسرے کو سناتے ہوں گے اور یہیں سے داستانوں کی ابتدا ہوئی ہوگی مگر اس دور میں لکھنے کا رواج نہیں تھا اس لئے ان کے ادب کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر مبارک علی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "کیونکہ قدیم پتھر کے زمانے میں لکھنے کا رواج نہیں تھا اس لیے ہمیں ان کے ادب کے بارے میں معلوم نہیں مگر ان کا آرٹ آج بھی خوبصورتی اور رنگوں کے ساتھ موجود ہے۔ اس عہد کی تصاویر ہمیں غاروں میں ملی ہیں جو دیواروں اور چھتوں پر بنائی گئی ہیں۔ ان تصاویر میں جو رنگ استعمال کیے گئے ہیں وہ آج بھی اپنی تازگی کے ساتھ موجود ہیں۔ ان تصاویر کے موضوعات شکار کے مناظر ہیں۔ کہیں ارنا بھینسوں کے ریوڑ کو بھاگتے ہوئے دکھایا گیا ہے تو کہیں دوسرے جانوروں کی شکلیں ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ یہ تصاویر ان غاروں میں ہیں کہ جہاں سورج کی روشنی نہیں جا سکتی تھی جس کی وجہ سے یہاں گہرا اندھیرا تھا اس لئے یہ تصویریں آگ روشن کر کے بنائی گئی ہوں گی۔"(12)

ان تصاویر کی وجہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کو حسنِ فطرت کا ادراک ہو چکا تھا اور وہ اس آرٹ کو اپنے آنے والے زمانہ تک پہنچانا چاہتا تھا۔ اسی دور میں انسان نے برتن اور زیورات بنانے شروع

کر دیئے تھے۔اس دور میں زیورات جانوروں کی ہڈیوں سے بنائے جاتے تھے۔ قدیم پتھر کے زمانے میں مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں تھا۔ دونوں ساتھ مل کر شکار کرتے تھے۔ عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی تھیں۔اس دور میں انسان نے غذا جمع کرنے کے عمل کو چھوڑ کر غذا اگانا شروع کر دی تھی۔ جب انسان نے کاشتکاری شروع کی تو فصل کی دیکھ بھال کے لئے اسے ایک جگہ آباد ہونا پڑا۔اس مرحلے پر بستیوں کی ابتدا ہوئی۔ قدیم پتھر کا زمانہ سست روی سے چلتا ہوا جدید پتھر کے زمانے تک آیا اور قدیم اور جدید کا ملاپ ہوا۔

ابتدا میں انسان نے ان علاقوں میں بستیاں آباد کیں جہاں دریا قریب تھے۔ دنیا کی زیادہ تر تہذیبیں دریا کے کنارے آباد تھیں کیونکہ یہاں سے بنیادی انسانی ضرورت پانی آسانی سے دستیاب ہوتا تھا۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ کا خیال ہے کہ کاشتکاری کی ابتدا مشرق وسطی سے ہوئی کیونکہ یہاں کے دریاؤں کے پانی کی وجہ سے زمین بہت زرخیز تھی۔ یہاں کے لوگوں نے بھیڑ بکریاں اور دوسرے مویشی بھی پالنا شروع کر دیے تھے۔اس دور تک پہنچتے پہنچتے انسان نے جانوروں کی کھال سے لباس کا کام لینا شروع کر دیا تھا۔ جدید پتھر کے زمانے کا انسان انقلابات کی شروعات کر چکا تھا۔

اس نے ایشیاء سے سفر شروع کیا اور یورپ تک گیا۔ انسان نے جدید اوزار بنائے۔ زراعت کے آلات بنائے۔ گھروں کی تعداد بڑھی اور گاؤں کی شکل اختیار کر گئی۔ جب لوگ گاؤں میں مل کر رہنے لگے تو سماجی تعلقات قائم ہوئے اور یوں رسم و رواج کی داغ بیل پڑی۔ اس طرح گروہ، قبیلے اور برادری کی شکلیں سامنے آئیں۔ زرعی معاشرے میں سماج کی ابتدا ہوئی۔ ہر بستی میں گودام بنائے جانے لگے جہاں ضرورت سے زیادہ غذا جمع کی جانے لگی۔ اسی دور میں آبادی میں بھی اضافہ ہوا۔ طاقتور اور مذہبی لوگ کسان کی مہیا کردہ غذا پر پلنے لگے۔ اس مرحلے پر طبقے وجود میں آئے اور جنگوں کی ابتدا بھی اسی دور میں ہوئی۔ جدید پتھر کے دور میں انسان کے کپڑا بُننے کی ابتدا ہوئی۔ پہیہ کی ایجاد ہوئی تو ٹیکنالوجی میں انقلاب آ

گیا۔ پہلے اس کا استعمال برتن بنانے کے لیے کیا گیا بعد میں گاڑی کو لگایا گیا اور اسی سے گیہوں کا کام بھی لیا جانے لگا۔

جدید پتھر کا زمانہ، زمانی ترتیب میں نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔ اس دور میں لوگوں نے الگ الگ شعبوں سے منسلک ہو کر کام کرنا شروع کر دیا۔ جدید پتھر سے کانسی کے زمانے تک تہذیب نے ایک طویل درمیانی عرصہ طے کیا جس میں پرانی روایات کے ساتھ نئی روایات بھی جگہ لے رہی تھیں۔

یہ تبدیلی چار ہزار سال قبل مسیح میں جا کر پوری ہوئی اس وقت قدیم علم و فن اور جمع شدہ تجربہ نئے حالات میں آ کر مل گئے۔ اس نے ایک نئے عہد کی ابتدا کی جسے کانسی کا عہد کہا جاتا ہے۔ کانسی کی تہذیبوں میں سب سے اول تہذیب میسوپوٹامیہ (بابل و نینوا) کی تہذیب ہے۔ کانسی کے زمانے کی تہذیب کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس دور میں شہر وجود میں آ گئے تھے۔ اس سے پہلے لوگ گاؤں میں رہتے تھے جہاں کسان کھیتی باڑی کرتے تھے اور مویشی پالتے تھے۔ جب اس زراعت کی وجہ سے غذا وافر مقدار میں پیدا ہونے لگی تو شہر آباد ہونا شروع ہو گئے۔ شہری لوگ غذائی پیداوار کے عمل میں شریک نہیں تھے اس لئے انہوں نے مختلف پیشوں کو اختیار کر لیا۔ ان کی سرگرمیوں نے ایک نئی تہذیب کو پیدا کیا جس میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ اس عمل کو شہری انقلاب کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ شہر میں جو اہم طبقے پیدا ہوئے ان میں پجاری، کاریگر، مزدور، تاجر اور عہدے دار تھے۔ کانسی کے دور کی ایک اہم ایجاد مختلف تہذیبوں میں رسم الخط کی ابتدا ہے۔ اس کی ضرورت تجارت کی وجہ سے حساب کتاب کے لیے ہوئی کیونکہ زبانی حساب کتاب کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا اس لئے ضروری تھا کہ حساب کتاب کے معاملات تحریر کیے جائیں۔ تحریر کی وجہ سے معاشرے میں کاتبوں اور منشیوں کا طبقہ پیدا ہوا جن کے علم کی وجہ سے ان کی اہمیت ہو گئی۔ تحریر کے وجود میں آنے کے بعد تاریخ کا غیر آثاریاتی دور ختم ہو گیا اور باقاعدہ تاریخ کا آغاز ہوا۔ اس وجہ سے لوگوں کی زندگیوں میں بہت تبدیلی آئی ہے خاص طور پر شہر کے لوگوں میں اس کو

اہمیت ملی۔ شہری لوگ تہذیب کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں نمایاں رہے۔ شہروں میں ہی موسیقی، رقص، مجسمہ سازی، ادب، ٹیکنالوجی، میلوں، جلوسوں اور کھیلوں کو فروغ حاصل ہوا جس نے شہریوں کی زندگی کو اور زیادہ دلکش بنا دیا۔

جب شہر ترقی کرنے لگے تو ادب و آداب اور زبان میں وسعت اور شائستگی آتی چلی گئی اور تہذیب میں نکھار پیدا ہوتا گیا۔ انسان نے پتھر کے زمانوں میں جو سیکھا تھا اس کا تجربہ رفتہ رفتہ آنے والے لوگوں میں منتقل ہوتا رہا یہاں تک کہ کانسی کے عہد میں اس نے نہ صرف ماضی کے ان تجربات اور مشاہدات سے فائدہ اٹھایا بلکہ اسے آگے بڑھاتے ہوئے تہذیب کے نئے دور کا آغاز کیا جس کی سب سے بڑی علامت اس کے شہر تھے۔ ان شہروں کے کھنڈرات آج بھی ماضی کی ان تہذیبوں کی کہانی بیان کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی اس بارے میں لکھتے ہیں کہ :

"قدیم تہذیبوں کی دریافت نے انسان کے ذہن کو کھولا اس کے علم میں اضافہ کیا اور اس پر یہ روشن ہوا کہ ارتقاء اور مرحلہ وار ترقی انسانی تہذیب بناتی ہے۔"(13)

اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی بھی تہذیب اچانک وجود میں نہیں آتی اور نہ ہی پختگی تک پہنچتی ہے۔ تہذیب کا ایک ارتقائی عمل ہوتا ہے۔ یعنی کسی بھی علاقے میں وہاں کے حالات، ماحول، لوگوں کی ضرورت اور تقاضوں کے تحت آہستہ آہستہ بنتی ہے۔ بحیثیت مجموعی جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ تہذیب خالص انسان کی محتاج ہے اور انسان ہی اس کا واحد ضامن ہے۔ تہذیب اور انسان لازم و ملزوم حقیقتیں ہیں یعنی انسان کے بغیر تہذیب کا وجود ممکن نہیں اور نہ تہذیب کے بغیر انسان انسان کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔ تہذیب انسان کی نوعی انفرادیت ہے۔ یہی انفرادیت اسے باقی جانداروں سے ممتاز کرتی ہے۔ انسان واحد مخلوق ہے جو تہذیبی ارتقاء پر قادر ہے یہی وجہ ہے کہ انسان نے قدیم پتھر کے

زمانے سے لے کر آج تک تہذیب کے ارتقاء اور ترقی میں مسلسل کوشش کی اور ہر ایک دور میں اپنی ایجادات کی بدولت تہذیبی ارتقاء میں اضافہ کیا۔

3۔ دنیا کی قدیم تہذیبیں:

جب سے کائنات بنی اور انسان اس زمین پر آباد ہوا تب سے لے کر تاحال دنیا میں ہزاروں کی تعداد میں تہذیبیں ابھری اور نجانے کتنی تہذیبیں اپنا نام و نشان چھوڑے بغیر مٹ گئیں۔ کچھ تہذیبیں آثار کی صورت میں اپنے نقوش چھوڑ گئیں۔ تہذیبیں یا پرانی بستیاں یا تو زمین میں دب کر نظروں سے اوجھل ہو گئیں یا آب و ہوا اور موسموں کی سختیوں سے بالکل ختم ہو کر رہ گئیں۔ کچھ تہذیبوں کو طوفان نے ختم کیا تو کچھ زلزلوں کی وجہ سے مٹ گئیں۔ کچھ تہذیبیں وقت کے ساتھ نہ چلنے کی وجہ سے جمود کا شکار ہو کر ختم ہو گئیں۔ تہذیبوں کے ختم ہونے کا تذکرہ قرآن میں بھی کئی جگہ موجود ہے مثلاً سورہ الکہف کی آیت نمبر 59 میں ارشاد ہے:

"اور یہ بستیاں ہم نے تباہ کر دیں جب انہوں نے ظلم کیا اور ہم نے ان کی بربادی کا ایک وعدہ رکھا تھا۔"(14)

سورۃ طٰہٰ کی آیت نمبر 98 میں ارشاد ہے:

"اور ہم نے پہلے کتنی قومیں ہلاک کیں، کیا تم ان میں کسی کو دیکھتے ہو یا ان کی بھنک (ذرا بھی آواز سنتے) ہو۔"(15)

ان آیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کی نہ جانے کتنی ہی بستیاں یعنی تہذیبیں تباہ و برباد ہوئیں۔ تہذیبوں کے ختم ہو جانے کی وجہ کوئی بھی ہو جب تک انسان کے پاس علم نہیں تھا کہ وہ ان پرانی بستیوں کے کھنڈرات کو دیکھ کر ہی حیران رہ جاتا تھا اور یہی خیال کرتا تھا کہ پرانے زمانے میں یہاں جن بھوت یا

کوئی مافوق الفطرت مخلوق رہتی ہو گی۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب انسان نے غور و فکر کیا اور اس کا علم بڑھا تو ان کھنڈرات کی مدد سے ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے پرانی بستیوں کو دریافت کرنا شروع کیا۔ جب کھدائی کے بعد بستیاں ملیں تو ان بستیوں کے نقشے اور یہاں سے ملنے والی اشیاء کی مدد سے پرانی تہذیبوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش تحریری شکل میں کی گئی۔

قدیم زمانے میں جو لوگ خانہ بدوش تھے ان کے ہاں تو کوئی تہذیب نہیں ابھری مگر جب انسان کا حضروی دور شروع ہوا اور وہ مختلف علاقوں میں آباد ہوا تو اس وجہ سے دنیا کے مختلف علاقوں سے مختلف تہذیبوں کے آثار ملے۔ماہرینِ آثارِ قدیمہ عراق کو قدیم ترین تہذیب قرار دیتے ہیں جس کا زمانہ 3500 قبل مسیح میں ہے۔ اس کے بعد مصری تہذیب 3100 قبل مسیح، وادی سندھ کی تہذیب 2500 قبل مسیح، چینی تہذیب 1500 قبل مسیح وغیرہ۔ دریافت شدہ تہذیبوں میں وادی سندھ کی تہذیب ایسی ہے جس کے درست زمانے کے بارے میں ابھی تک معلوم نہیں کیا جاسکا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وادی سندھ سے جو کتبے ملے ہیں ان کی تحریر ابھی تک نہیں پڑھی جا سکی۔ باقی تہذیبوں سے ملنے والے کتبوں کی تحریروں کو پڑھ کر ان کے زمانے کا تعین کیا گیا ہے۔

میسوپوٹامیہ کی تہذیب:

میسوپوٹامیہ کے معنی "دو دریاؤں کے بیچ باقی سرزمین" کے ہیں۔ یہ دونوں دریا دجلہ و فرات ہیں جن کے ساحلوں پر یہ تہذیب ابھری جو دنیا کی اولین تہذیبوں میں شمار ہوتی ہے اور یہ سمیری تہذیب کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ تہذیب 3500 قبل مسیح سے 1900 قبل مسیح تک برقرار رہی۔اس تہذیب کی ترقی کا باعث دریاؤں کی قربت تھا جس کی وجہ سے یہاں زراعت آسانی سے کی جاتی۔ ساتھ ہی تانبے اور کانسی کی دھاتوں نے بھی اس تہذیب کی ترقی میں حصہ لیا۔

زراعت نے سمیری تہذیب کو ابھرنے، آگے بڑھنے اور پھیلنے میں مدد دی۔ زرخیز زمین، آبپاشی کا نظام اور کسانوں کی محنت نے پیداوار کو بڑھایا۔ اس تہذیب کا زیادہ دارو مدار زراعت پر ہی تھا۔ سمیری تہذیب کے افراد حساب کتاب اور اعداد و شمار کے لئے گنتی سے واقف تھے۔ ناپ تول اور پیمائش کے اصول طے کر چکے تھے۔ وقت کو انہوں نے چوبیس گھنٹوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اہل سمیر نے اپنی ضروریات کے پیشِ نظر تجارت بھی شروع کر دی تھی۔ وہ تانبا، ٹن، لکڑی، مہریں اور برتن وغیرہ دوسرے ممالک سے منگواتے تھے۔ تجارت دریا اور خشکی کے راستوں سے ہوتی تھی۔ تجارت نے جہاں ان کے معاشی حالات کو بہتر بنایا وہاں اس کی وجہ سے یہ لوگ دوسری تہذیبوں کے لوگوں سے بھی واقف ہوئے۔

کھدائی کے بعد ایسی مہریں ملی ہیں جن پر نقش و نگار اور مختلف قسم کی علامتیں ہیں جن کا مقصد لوگوں کو بیماریوں اور مصیبتوں سے دور رکھنا تھا۔ یہی لوگ آگے چل کر پجاری ہوئے۔ اہل سمیر میں دیوی دیوتاؤں کی بہت تعداد تھی۔ انہوں نے ہر کام کیلئے الگ دیوتا بنا رکھے تھے۔ ہر شہر میں مندر ہوتا تھا اور ہر شہر کا اپنا دیوتا ہوتا تھا جو ان کی حفاظت کرتا تھا۔ سمیری تہذیب میں تحریر کا آغاز ہو گیا تھا۔ سمیری تہذیب کا جب ایک سیاسی ڈھانچہ بن گیا تو انہیں معاہدوں کی ضرورت پڑی۔ اس کے علاوہ تجارت اور لین دین میں بھی تحریر کی ضرورت محسوس کی گئی تو اہل سمیر نے تصویری رسم الخط ایجاد کیا۔ یعنی تصویر بنا کر ایک خاص چیز کو بنایا جاتا تھا۔ سمیری تہذیب کے زمانے میں لکھنے کے لیے اہل سمیر نے مٹی کی تختیوں کو استعمال کیا۔ سب سے پہلے جن لوگوں نے پڑھنا لکھنا سیکھا وہ مندروں کے پجاری تھے، اس کے بعد حکمرانوں، تاجروں نے بھی لکھنا پڑھنا سیکھا اور جلد ہی سمیری تہذیب میں شعراء اور ادباء بھی پیدا ہونے لگے۔

دنیا کی قدیم داستان "گل گا میش" اہلِ سمیر نے تحریر کی تھی۔ سمیری تہذیب کے شہروں کی کھدائی کے بعد جو آثار و شواہد ملے ہیں ان سے اہل سمیر کی روزمرہ زندگی، ان کے کھانے، لباس، رہائش کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ اہل سمیر جھونپڑیاں بناتے تھے یا پکی اینٹوں کے مکان بنا لیتے تھے۔ امراء کے مکانات دو منزلہ ہوتے تھے جبکہ عام لوگ ایک منزلہ مکان میں رہا کرتے تھے۔ سمیری تہذیب جب ترقی کر کے انتہائی عروج پر پہنچ گئی تو آبادی بڑھی جس کے ساتھ لوگوں کی ضروریات بھی بڑھ گئی تو لوگ نئی زمینوں کی تلاش میں نکلے تاکہ انہیں کاشتکاری کے قابل بنا سکیں۔ جب زمین کم پڑ گئی تو لوگوں نے ہمسایہ شہروں پر حملے کر کے دولت اور ساز و سامان لوٹنا شروع کر دیا۔ اس سے جنگ کی ابتدا ہوئی۔ جب خانہ بدوش قبائل کے حملے بڑھے تو شہر کے گرد قلعے و فصیلیں تعمیر کی گئیں اور حملہ آور قبائل سے باقاعدہ جنگ شروع ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی جنگی ہتھیار و اوزار میں بھی ترقی ہوئی تو انسان خون ریزی اور قتل و غارت پر ایسا مائل ہوا کہ اس میں محبت کی جگہ نفرت آگئی اور ایک ترقی یافتہ تہذیب زوال پذیری کی جانب بڑھی اور آج آثار کی صورت میں حسرت کی تصویر بنی پڑی ہے۔ اس تمام عروج و زوال کے باوجود سمیری تہذیب دنیا کی قدیم تہذیب ہے جس نے باقی تہذیبوں پر بھی اثرات مرتب کیے ہیں عبدالحمید اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "سرزمین عراق آج سے ہزارہا برس بیشتر عظیم الشان تہذیب کا گہوارہ تھی۔ اس کے عالیشان گھر اور اس کی مٹتی ہوئی یادگاریں اس کی گزشتہ عظمت کی گواہ ہیں۔"(16)

مصری تہذیب:

مصری تہذیب دنیا کی قدیم اور ترقی یافتہ تہذیب ہے۔ اس کی دریافت میں ماہرینِ آثارِ قدیمہ کا بڑا حصہ ہے جنہوں نے اس کی قدیم عمارتوں خاص طور پر اہرام مصر کی کھدائی کر کے اس تہذیب کی اہمیت کو

دنیا کے سامنے اجاگر کیا۔ چونکہ دریائے نیل میں ہر سال سیلاب آتا تھا جو اپنے ساتھ زرخیز مٹی لاتا تھا اس وجہ سے کاشتکاری کے لیے یہ علاقہ بھی زرخیز تھا اسی لیے یہاں مصری تہذیب ابھری اور پھیلی۔ مصر میں ریاست کا وجود وقت کے ساتھ ساتھ ہوا۔ ابتدا میں برادریاں تھیں جو گاؤں میں رہتی تھیں اور کاشتکاری کرتی تھیں۔ بعد میں انہی برادریوں نے مل کر گروہ بنائے اور گاؤں سے قصبوں میں آباد ہوئے اور اس طرح ایک سلطنت کی بنیاد ڈالی گئی۔ بادشاہت قائم ہوئی تو بادشاہ نے دیوتا ہونے کا اعلان کیا جو فصلوں کو زرخیز کرتا اور مویشیوں کی تعداد بڑھاتا تھا۔ اس طرح اس کی ذات بلند ہو گئی۔ فوجی طاقت ہونے کی وجہ سے بادشاہ کسانوں سے نذرانے لیتا، فصلوں پر محصول وصول کرتا، اسی طرح اس کے پاس بہت سارے اختیارات ہوتے۔ اس دور میں مصر کے بادشاہوں کا خطاب فرعون پڑا۔ جب کوئی فرعون مر جاتا تو اس کے ساتھ اس کی ساری دولت بھی دفن کر دی جاتی۔

مصر میں ریاست کا انتظام چلانے کے لئے بہترین، تربیت یافتہ اور پڑھی لکھی انتظامیہ تھی جس کا تعلق امراء کے طبقے سے ہوتا۔ ان کے ساتھ جو کام کرتے ان میں کاتب، منشی، کلرک وغیرہ شامل تھے۔ مصری تہذیب کی سب سے بڑی پہچان اس کے اہرام ہیں۔ ان کی تعمیرانہ مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ فرعونوں نے اہرامِ مصر کی تعمیر کسانوں سے زبردستی اور جبری مشقت کروا کے کی۔ ان کی تعمیر میں غلاموں کو بطور مزدور کام کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ اہرام فرعونوں کے مقبرے ہیں۔ یہ پتھر کی چٹانوں سے تعمیر کیے گئے ہیں۔ یہ اہرام مصر کے صحرا میں بکھرے ہوئے ہیں اور ان اہراموں میں فرعونوں کی حنوط شدہ لاشیں اور ان کے ساتھ ان کا ساز و سامان اور خزانہ تھا جو ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے اکٹھا کر کے مختلف عجائب گھروں میں رکھ دیا۔ اہرام کی دیواروں پر تصاویر بنائی گئی ہیں جن کی مدد سے اس زمانے کے لوگوں کی زندگی کے متعلق بہت سی معلومات ملتی ہیں۔ اہرام کے ساتھ ابولہول (Sphinx) کا مجسمہ بھی تراش کر رکھا ہوا ہے تاکہ وہ ان کی حفاظت کرے۔

مصریوں کا معاشرہ زراعتی تھا اس لئے ان کے دیوتاؤں کا تعلق زراعت سے ہوتا تھا۔ ان کے دیوتا جانوروں اور پرندوں کی شکل کے تھے۔ اس کے علاوہ سورج اور چاند بھی ان کے دیوتا تھے۔ فرعون یعنی مصری بادشاہ خود کو دیوتا کا بیٹا کہتے تھے۔ مصر میں سیاست اور مذہب آپس میں ملے ہوئے تھے۔ اس لیے فرعون جہاں اپنے لیے اہرام بنواتے تھے وہاں مندر بھی تعمیر کرواتے تھے جسے مجسموں اور تصویر سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ مصریوں کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد ایک دوسری زندگی شروع ہو جاتی ہے اس لئے وہ جسم کو محفوظ بنانے کے لیے ممی بنا لیتے تھے۔ اس رسم کی وجہ سے مصری لوگ انسانی جسم اور اس کی بناوٹ سے واقف ہو گئے تھے جس نے سرجری کے علم کو آگے بڑھانے میں مدد دی۔ مصریوں نے جس رسم الخط کو ایجاد کیا وہ ہیروغلیفی مقدس تحریر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کی ابتدائی شکل تصویریں تھیں۔ یہ رسم خط سیکھنا مشکل تھا لیکن حکومت کی ضرورت کے تحت مدرسے قائم کئے گئے جہاں طالب علم سیکھ کر کاتب اور منشی کی ملازمتیں حاصل کر لیتے تھے۔ مصر میں لکھنے کے لیے پیپرس کے پتے کو استعمال کیا جاتا تھا۔ لکھنے کے بعد اسے تہوں میں لپیٹ دیا جاتا تھا جس سے کتاب کی شکل بن جاتی تھی۔ دریائے نیل کے کنارے سے ماہرینِ آثارِ قدیمہ کو ایسا پتھر ملا تھا جسے روزیٹا کہا گیا۔ اس پر قدیم مصری زبانوں میں ہیروغلیفی رسم الخط میں تحریر تھی۔ اس رسم الخط کو یونانی زبان کی مدد سے ترجمہ کرا کے پڑھا گیا۔ اس سے رسم الخط بھی دریافت ہوا اور مصر کی قدیم تہذیب کو جاننے میں بھی مدد ملی۔ کسی معاشرے کی روزمرہ زندگی سے ہی اس کی تہذیب کی ترقی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مصری تہذیب ترقی یافتہ تھی۔

علی عباس جلال پوری لکھتے ہیں کہ :

> "مصریوں کو فنونِ لطیفہ سے گہری دلچسپی تھی۔ فنِ تعمیر، مجسمہ سازی، مصوری اور شاعری میں انہوں نے ناقابل فراموش شاہکار پیش کیے۔ ان کے اہرام کا شمار عجائبات عالم میں ہوتا رہا ہے۔ اہرام کی تعمیر پر دو ہزار برس

گزر چکے تھے جب یونانیوں نے انہیں دنیا کے سات عجائبات میں شمار کیا

تھا۔"(17)

دنیا کی دیگر تہذیبوں کی طرح مصری تہذیب بھی وقت کے ساتھ ساتھ زوال کا شکار ہونا شروع ہو گئی تھی۔ زوال کی ایک وجہ اس کا ریاستی نظام تھا جو رعایا کے ساتھ جبر اور سخت رویہ رکھتا تھا۔ کسانوں سے ان کی زائد پیداوار ہتھیا لی جاتی تھی اور اس دولت کو اہرام و محلات اور مندروں کی تعمیر میں خرچ کیا جاتا تھا۔ معاشرے میں امیر و غریب کے درمیان بہت زیادہ فرق تھا اسی وجہ سے عام لوگوں نے حکومت کے خلاف بغاوتیں شروع کر دیں۔ جب حکمرانوں نے انہیں کچلنا چاہا تو اس نے زراعت، تجارت اور لوازماتِ زندگی کو تباہ کر دیا۔ اس کے علاوہ ملک کی بڑی دولت جو فرعونوں کے ساتھ دفن کر دی گئی تھی اس وجہ سے خزانے ختم ہو گئے تھے اور ترقی یافتہ تہذیب زوال کا شکار ہو کر ختم ہو گئی۔

چینی تہذیب:

چین دنیا کے دوسرے ممالک اور اقوام سے الگ رہا ہے اس لیے اس کی تہذیب کے بارے میں معلومات بہت کم تھیں۔ مگر جب 1900 قبل مسیح میں شمالی چین میں قدیم آثار دریافت ہوئے جن میں جانوروں کی ہڈیوں پر لکھی تحریریں ملیں تو ان تحریروں سے چین کی پرانی تہذیب کے بارے میں حیران کن معلومات سامنے آئیں۔ دفن ہتھیار دریافت ہوئے تو اس سے ثابت ہو گیا کہ چین نے دنیا کی قدیم ترقی یافتہ تہذیب پیدا کی تھی۔ قدیم دور میں بھی چین میں بڑی سلطنتیں قائم ہوئیں۔ ان میں شانگ خاندان اور چاؤ خاندان وغیرہ شامل ہیں۔ ان خاندانوں کے حکمرانوں نے دیگر ریاستوں کو شکست دے کر انہیں اپنے تابع بنایا۔ جب ان خاندانوں پر زوال آیا تو چین میں خانہ جنگی کا زمانہ شروع ہوا۔ ان جنگوں میں ہزارہا لوگ مارے گئے۔ چین میں سیاسی انتشار کو ختم کر کے امن و امان کی فضا جس خاندان نے پیدا کی وہ چن خاندان تھا۔ چن خاندان نے چین کو سیاسی طور پر متحد کیا اور حملہ آوروں سے محفوظ رکھنے کے لئے انہوں نے دیوار

چین بنائی۔ اس خاندان کے حکمرانوں نے سب سے پہلے شہنشاہ کا خطاب اختیار کیا۔ اس دور میں جو اصطلاحات ہوئی ان میں چینی زبان کا معیاری رسم الخط، سکے کی ایجاد، وزن پیمائش کے اصول قابل ذکر ہیں۔

اس خاندان کے کارناموں کی وجہ سے ملک کا نام چین پڑ گیا۔ اس کے بعد آنے والا خاندان ہان تھا۔ اس کے عہد میں چین میں نوکر شاہی کی بنیاد پڑی۔ چینی معاشرہ بھی مختلف طبقوں میں بٹا ہوا تھا ان میں اونچی ذات بادشاہ کی تھی، اس کے بعد پانچ طبقے تھے جن میں دانشور، تاجر، کاریگر، کسان اور ملازم تھے۔ ان میں پڑھے لکھے طبقے کی زیادہ اہمیت تھی۔ لیکن یہ طبقہ امراء کے لیے مخصوص تھا۔ چینی حکمرانوں کو اس بات کا احساس تھا کہ حکومت کے انتظام کے لئے ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو ذہین، تیز، باصلاحیت، تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ ہوں۔ اس مقصد کے لیے ایک ادارہ قائم کیا گیا جس کے زیر انتظام عہدیداروں کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ پہلے امتحانات ہوا کرتے تھے۔ امیدواروں کے لیے ضروری تھا کہ وہ ادب، تاریخ، اخلاقیات اور سیاسیات کا گہرا مطالعہ کریں۔ چین میں طب کے حوالے سے خاص طور پر تحقیق ہوئی اور انسانی جسم کے بارے میں معلومات اکٹھی کی گئیں۔ اس تحقیق کے نتیجے میں بہت ساری بیماریوں کے بارے میں پتہ چلا۔ وہ جڑی بوٹیوں سے دوائی تیار کرتے تھے۔ باقی تہذیبوں کی طرح چین کی تہذیب میں بھی شاندار محلات، جدید ہتھیار، دلکش زیورات وغیرہ ملے ہیں۔ چین میں تجارت بھی ہوتی تھی چین کے تاجر دوسرے ملکوں میں سلک، چینی کے برتن اور لوہے سے بنی اشیاء لے جاتے تھے اور ان کے بدلے میں سونا چاندی لے کر آتے تھے۔

چین کی زبان دنیا کی قدیم زبانوں میں سے ایک ہے جس کا رسم الخط موجود تھا۔ ابتدا میں چینی لوگ ہڈیوں پر لکھتے تھے بعد میں سلک کے کپڑے پر لکھائی ہونے لگی۔ اس کے علاوہ درختوں کی چھال و بانس سے تیار کئے ہوئے ٹکڑوں اور پرانے کپڑوں کو بھی لکھائی کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ چین میں سب

سے پہلے کاغذ ایجاد ہوا جس کی وجہ سے علم کے پھیلاؤ میں اضافہ ہوا۔ رسم الخط اور زبان کے الفاظ کے ذخیرے میں چین نے ادب، فلسفہ اور سائنس کی ابتدا کی۔ اس دور کے حکمرانوں نے شاعری کی سرپرستی کی یوں چینی زبان کو انہوں نے علمی اور ادبی زبان بنادیا۔ چین میں تعلیم یافتہ افراد کے لئے خطاطی، مصوری اور شاعری میں مہارت حاصل کرنا ضروری تھا۔ چین کے حکمرانوں کو تاریخ سے بہت دلچسپی تھی۔ ان کی خواہش ہوتی تھی کہ تاریخ کے ذریعے ان کا نام اور کارنامے زندہ رہیں اس کے لیے دربار میں مورخین کو ملازم رکھا جاتا تھا تاکہ حکمران خاندان کے حالات لکھیں لہٰذا اس دور کے حکمرانوں کی تاریخ موجود ہے مگر اس تاریخ میں عام لوگوں کی طرزِ زندگی کے حوالے سے کچھ نہیں لکھا ہوا۔ کسی بھی تہذیب کی ترقی کا اندازہ اس کی ایجادات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس تہذیب نے انسانیت کو کتنا فائدہ پہنچایا اور دنیا کی ایجادات میں کتنے اضافے کیے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو چینی تہذیب اپنے دور کی ترقی یافتہ تہذیب تھی کیونکہ اس تہذیب کی ایجادات کی فہرست بہت طویل ہے۔ اس فہرست میں جو اہم ایجادات شامل ہیں ان میں اعشاری نظام، کاغذ، چھاپہ خانہ، کاغذ کی کرنسی، چینی برتن، سلک، ریشم، ماچس، چھتری، نقشوں کی مدد سے ستاروں کی نقل و حرکت کا مطالعہ اور دیوار چین وغیرہ شامل ہیں۔

یونانی تہذیب:

یونانی تہذیب 2000 قبل مسیح سے 200 قبل مسیح تک رہی۔ اس تہذیب کا کلاسیکل زمانہ 500 قبل مسیح سے 400 قبل مسیح تک رہا۔ اس وقت یونان نے آس پاس کے جزیروں پر قبضہ کر لیا تھا بلکہ روم کے مشرقی علاقوں میں بھی ان کی بستیاں آباد ہوگئی تھیں۔ یونان کا مشہور شہر ایتھنز اتھنا دیوی کی یاد میں آباد ہوا تھا۔ ابتدا میں شہر میں مختلف قبائل اور برادریاں آباد ہوئیں۔ اس شہر نے جلد ہی اپنی بندرگاہ کی وجہ سے شہرت حاصل کر لی۔ اس میں معدنیات کی کانیں تھیں جس کی وجہ سے تاجروں کا طبقہ بھی موجود تھا۔ ایتھنز میں اکثر و بیشتر سیاسی تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں۔ ابتدا میں یہاں بادشاہت تھی جس کی

وجہ سے مخصوص طبقے کے پاس سارے اختیارات تھے۔ اس وجہ سے کسانوں اور مزدوروں نے حکومت سے بغاوت کی اور سولن نامی قانون دان کو اپنا سربراہ بنالیا۔ اس نے امن کی پالیسی اختیار کی۔ ایتھنز کے لوگ جو غلام تھے ان کو آزاد کیا۔ اسمبلی کے ادارے شروع کیے جس کے ممبر تمام آزاد شہری ہو سکتے تھے۔ یوں ایتھنز کا نظامِ حکومت جمہوریت کہلایا۔ ایتھنز کی اسمبلی اہم فیصلے کرتی تھی اس لئے اس کا باقاعدہ اجلاس ہوتا تھا جس میں ہر طبقے کے لوگ شرکت کرتے اور مشورے دے سکتے تھے۔ شہر کے لوگوں کو یہ حق تھا کہ وہ ناپسندیدہ سیاستدانوں کو شہر سے باہر نکالنے کا فیصلہ بھی کر سکتے تھے۔ ایرانیوں نے جب یونان پر حملہ کیا تو ایتھنز کا شہر تباہ ہو گیا۔

یونان کی دوسری بڑی شہری ریاست اسپارٹا کی تھی۔ اسپارٹا کی ریاست کئی لحاظ سے ایتھنز سے مختلف تھی۔ اس کی جغرافیائی حیثیت بھی الگ تھی۔ یہاں واقع پہاڑوں نے اسے باقی ریاستوں سے الگ کر دیا تھا۔ یہ اپنے وقت کی ترقی یافتہ ریاست تھی اس وجہ سے اس نے صنعت و حرفت، موسیقی اور شاعری میں بہت ترقی کی۔ اس ریاست کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہاں کے ہر فرد کا فوجی ہونا لازمی تھا۔ اسپارٹا ریاست کے نظام حکومت میں بھی ایک اسمبلی ہوتی تھی جس کے ممبر شہر کے تمام مرد ہوتے تھے۔ اسپارٹا نے ایران کے خلاف جنگوں میں اہم کردار ادا کیا۔ مرد زیادہ وقت فوجی کیمپوں میں گزارتے تھے اس لیے ان کی گھریلو زندگی نہ ہونے کے برابر تھی یہی وجہ ہے کہ نہ تو اسپارٹا میں فلسفی پیدا ہوئے نہ ہی ادیب شاعر اور آرٹسٹ۔ سخت ماحول اور پابندیوں کی وجہ سے وہاں کے لوگ ذہنی طور پر مفلوج ہو کر رہ گئے۔ اسی لیے یہ شہری ریاست جلد ہی ختم ہو گئی۔ اہلِ یونان نے مجسمہ سازی کے ذریعے انسانی جسم اور خد و خال کو ڈھال کر اس کی خوبصورتی اور دلکشی کو اجاگر کیا۔ اس کے علاوہ تعمیر سازی میں بھی اہل یونان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

عبدالمجید خان نے اپنی کتاب "دنیا کی قدیم تہذیبیں" میں یونانی تہذیب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"یونان کی تہذیب نے دنیا پر جو حیرت انگیز اثر ڈالا ہے اس کی ایک وجہ یونانیوں کے علوم و فنون ہیں اور دوسرا وہ طرزِ زندگی ہے جس پر ایتھنز والے کئی صدیوں تک کاربند رہے۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ آج ہمارے پاس بے انداز سامان موجود ہیں جس سے یونانیوں اور خاص کر ایتھنز والوں کے علم و فن، تہذیب و تمدن اور اطوار کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی بہترین کتابیں تاریخیں، ڈرامے، نظمیں اور تقریریں صدیوں سے محفوظ چلی آرہی ہیں اور دنیا کے بڑے بڑے عالم فاضل لوگوں نے ان کا مطالعہ کر کے ان سے صنف حاصل کیا ہے۔ ایلیڈ اور اوڈیسی کے علاوہ یونانیوں کی اور بہت سی کتابوں کے پرانے قلمی نسخے بھی اب تک برطانوی عجائب خانے میں موجود ہیں۔"(18)

یونان میں 800 قبل مسیح تک لوگ لکھنا نہیں جانتے تھے اس وجہ سے لوک داستانیں اور کہانیاں زبانی ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی رہیں۔ جب تحریر کا رواج ہوا تو ان داستانوں کو لکھا جانے لگا۔ ہومر یونان کا بڑا شاعر ہے جس نے ایلیڈ اور اوڈیسی جیسی نظمیں لکھیں۔ یونانی ادیبوں اور شاعروں نے شاعری، ڈرامے اور تاریخ نویسی میں اہم اضافے کیے۔ یونانی ڈرامہ نگاروں نے اپنے ڈرامہ میں بہت ترقی کی۔ قدیم یونان میں بھی تھیٹر ہال موجود تھے جہاں ڈرامے پیش کیے جاتے تھے۔

یونان نے جن مشہور فلسفیوں کو پیدا کیا اور جن کے افکار آج تک زندہ ہیں ان میں سب سے مشہور سقراط ہے۔ اس نے اپنے زمانے کی روایات اور توہمات پر تنقید کی اس لیے ایتھنز میں اس پر مقدمہ چلایا گیا اور سزا کے طور پر اسے زہر پلایا گیا۔ یونان کا دوسرا بڑا فلسفی افلاطون، سقراط کا شاگرد تھا۔ اس نے مشہور کتاب ''جمہوریت'' لکھی۔ اس نے تجویز دی کہ معاشرے کو تین طبقوں میں تقسیم ہونا چاہیے۔ اس نے نوجوانوں کی تعلیم کے لیے ایک اکیڈمی کی بنیاد ڈالی تھی۔ افلاطون کا شاگرد ارسطو بھی یونان کا بہت

مشہور فلسفی اور سائنسدان ہے۔ ارسطو نے طب، حیاتیات، علمِ نجوم، فلسفہ اور ادب پر لکھا۔ اس کے خیالات نے آنے والوں کو بہت متاثر کیا۔

یونانی تہذیب نے دنیا کی دیگر تہذیبوں پر گہرے اثرات مرتب کئے خاص طور پر علمی و ادبی خیالات وافکار، یونانی تعمیرات، مجسمہ سازی، آرٹ اور ڈرامے نے دنیا کو بہت متاثر کیا۔ اہل یورپ نے قدیم یونان کی تہذیب کو دریافت کر کے ابھارا۔ اس کی پرانی کتابوں کو دوبارہ چھاپا اور شائع کیا اور اس طرح یونانی تہذیب ادب اور آثار کی صورت میں دوبارہ زندہ ہو کر سامنے آئی۔

رومی تہذیب:

روم پرانی اور نئی دنیا کو ملانے والی ایک کڑی ہے۔ یورپی اقوام کی زبان، رسم ورواج اور قوانین میں تفاوت پایا جاتا ہے لیکن ایک دوسرے سے بڑی مشابہت بھی رکھتی ہیں۔ یورپ کی تمام اقوام نے اپنے خیالات اور قوانین وغیرہ رومی تہذیب سے ہی لئے ہیں۔ رومی تہذیب نے اپنی طاقت اور قوت کی وجہ سے ایک بڑی سلطنت قائم کی تھی۔ اس سلطنت کی شان وشوکت کو بڑی بڑی عمارتوں کے ذریعے ظاہر کیا گیا تھا۔ یہی عمارتیں اور سیاسی ادارے رومی تہذیب نے بطور ورثہ چھوڑے۔ رومی تہذیب کی شہرت اس کے مشہور شہر روم سے ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ روموس جو روم کا پہلا بادشاہ تھا اس کے نام سے پڑا۔ اس کے بعد روم پر سات بادشاہوں نے حکومت کی۔ انہوں نے روم میں شاندار مندر تعمیر کرائے اور رومیوں کو لکھنا سکھایا۔ ان کا آخری بادشاہ بہت ظالم تھا۔ اس کا تختہ الٹ کر اہل روم نے جمہوری نظام حکومت قائم کیا۔

رومی تاریخ کا ابتدائی دور رومن ریپبلک کہلاتا ہے۔ رومیوں نے بادشاہت کے تجربے سے سیکھا تھا کہ اگر سارے اختیارات ایک ہی شخص کے پاس جمع ہو جائیں تو اس کے نتیجے میں بدعنوانی، ظلم، انتشار

اور ناانصافی پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے انہوں نے ایسا سیاسی نظام قائم کیا جس میں اختیارات اداروں کے پاس تھے۔ روم میں جمہوریت کے اہم ادارے سینٹ اور اسمبلی تھے۔ سینٹ میں امراء اور طاقتور قبیلوں کے سردار ممبر ہوا کرتے تھے۔ جب کہ اسمبلی میں تمام بالغ شہری ممبر ہوتے تھے۔ اس جمہوری نظام اور اداروں نے ایک عرصے تک روم میں آمریت اور بادشاہت کو روکے رکھا۔ رومی جمہوریت اور اس کے نظام میں اس وقت تبدیلی آئی جب رومی اپنے ہمسایہ ممالک سے جنگوں میں الجھے اور اس کے بعد ان کی جنگیں فونیقیوں سے ہوئیں جن کا تعلق شمالی اضلاع سے تھا اور وہ بحرِ روم کی تجارت پر کنڑول کرتے تھے۔ ان کے درمیان جنگ کی وجہ سسلی اور اس کی زرخیز زمین تھی۔

روم شہر کی ایک اہم خصوصیت اس کے مرکز میں فورم تھا جہاں اہل روم سیاست سے لے کر زندگی کے ہر پہلو اور معاملے پر بات چیت کرتے تھے۔ اسی فورم پر رومی قانون تختیوں پر لکھے ہوئے آویزاں تھے۔ رومی سلطنت میں کئی زبانیں بولی جاتی تھی مگر آہستہ آہستہ لاطینی زبان پوری سلطنت روم کی زبان ہو گئی اور اس کا استعمال حکومتی اور تجارتی معاملات میں ہونے لگا اور قوانین، شاعری، تاریخ اور فلسفہ سب لاطینی زبان میں لکھا جانے لگا تھا۔ لکھائی کے لئے پیپرس، کپڑا، کھالیں، یا مٹی کی تختیاں ہوتی تھیں۔ چونکہ کم تحریریں ہوا کرتی تھی اس لیے کتابیں بہت مہنگی اور نایاب تھیں۔ پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بھی بہت کم تھی۔ رومی سلطنت کے زوال کے بعد بھی زبان قائم رہی اور پورے یورپ کی علمی و ادبی زبان بن گئی۔ رومی امراء موسیقی اور موسیقار کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے لیکن عام لوگوں میں موسیقی اور رقص بہت مقبول تھا۔ رومیوں نے ایک وسیع سلطنت قائم کی مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ کمزور ہوتی چلی گئی۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ جب سلطنت بہت زیادہ پھیل گئی تو اس کا مختلف صوبوں اور علاقوں سے رابطہ نہ رہا۔ سرکاری عہدیدار نااہل تھے۔ ذاتی مفادات پر توجہ دی جاتی تھی۔ جس نے اخلاقی قدروں اور روایات کو کمزور کر دیا۔ روم شہر میں بدامنی پھیل گئی اور لوگ محفوظ نہ رہے۔

ہمسایہ قبائل نے حملے شروع کر دیئے تو اس کی وجہ سے روم کی فوجی طاقت بھی ختم ہو کر رہ گئی اور ان قبائل کے ہاتھوں رومی تہذیب تباہ و برباد ہو کر محض کھنڈروں کی صورت میں یادگار بن کر رہ گئی۔

مذہب کے معاملے میں رومی روادار تھے۔ ان کی سلطنت میں لوگ ہزاروں دیوی اور دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے اور انہیں انسانی شکل میں پیش کرتے تھے اور ان سے ڈرتے تھے۔ اس لیے جب وہ بیمار ہوتے، خطرے میں پڑتے یا فصل خراب ہوتی تو ان دیوتاؤں سے مدد مانگتے۔ انہیں خوش رکھنے کے لئے نذرانے اور قربانی بھی دیتے۔ مندروں میں پجاری ہوتے جو مذہبی رسومات ادا کرتے۔ سب سے بڑا پجاری شہنشاہ روم ہوا کرتا تھا جو لوگوں اور دیوتائوں کے درمیان رابطے کا کام کرتا تھا۔ اکثر رومی شہنشاہ کو مرنے کے بعد دیوتا قرار دے کر اس کی پوجا کی جاتی تھی

وادی سندھ (ہڑپہ اور موہن جو داڑو) کی تہذیب:

وادی سندھ کا علاقہ ایران اور افغانستان کے درمیان افغانستان کی سطح مرتفع کے مشرق میں واقع ہے۔ زمانہ قدیم سے بلوچستان کے چند دروں کے ذریعے وادی سندھ اور اس کی سطح مرتفع کے مابین تہذیبی اور تجارتی تعلقات رہے ہیں۔ اس علاقے کے جنوب مغرب میں پاکستان کی ساحلی پٹی خلیج فارس کے ساحلی راستے اور بحیرۂ عرب کے ذریعے وادی سندھ کو دوسرے ممالک سے ملاتی ہے۔ شمال میں ہمالیہ اور مشرق میں راجپوتانہ کے ریگستان نے اس علاقے کو قدرتی طور پر ایک جغرافیائی وحدت بنا رکھا ہے جسے برقرار رکھنے میں دریائے سندھ کو اہمیت حاصل ہے۔ دنیا کی تقریباً تمام قدیم تہذیبیں دریاؤں کے نزدیک وادیوں میں پیدا ہوئیں اور وہیں پروان چڑھیں مثلاً وادیِ نیل کی تہذیب (مصری تہذیب) یا وادیِ دجلہ و فرات کی تہذیب وغیرہ۔ اسی طرح دریائے سندھ کے قریب وادیِ سندھ میں دنیا کی عظیم الشان باقی تہذیبوں کی طرح عروج و زوال سہ کر زمین میں دفن ہو کر نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ یہاں تک کہ 1921 میں ایک کھدائی کے دوران یہاں سے مہریں اور برتن ملے۔ اس دریافت نے ماہرین کو یہ سوچنے

پر مجبور کر دیا یہ تہذیب بہت پھیلی ہوئی ہے۔اس طرح مزید کھدائی کے دوران ہڑپہ اور موہن جوداڑو کے شہر دریافت ہوئے۔ محمد ادریس صدیقی اپنی کتاب "وادیِ سندھ کی تہذیب" میں لکھتے ہیں:

> "وادی سندھ کی تہذیب ایک ہزار میل سے زیادہ وسیع علاقے پر پھیلی ہوئی تھی۔اس کی عملداری بابل سے چار گناہ اور مصر سے دوچند وسیع علاقے پر تھی اور جتنی باقعاتی تفتیش آگے بڑھتی ہے اس کا دامن وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔اس وسیع علاقے میں ہزاروں بستیاں آباد رہی ہوں گی جس میں سے متعدد بستیوں کی نشاندہی کی جاچکی ہے۔ان بستیوں میں باقیاتی دریافت کے اعتبار سے موہن جوداڑو، ہڑپہ، چہنوارو، ستکاجن دور، علی مراد، آمری، دابر کوٹ اور کوٹ ڈیجی بہت اہم ہیں۔"(19)

ابتدا میں اس تہذیب کو ہڑپہ تہذیب کہا جاتا تھا کیونکہ ہڑپہ پہلا شہر تھا جو دریافت ہوا۔ لیکن اس تہذیب کے آثار اور شہروں سے ملے جو کہ دریائے سندھ کی وادی میں تھے تو اسے وادیِ سندھ کی تہذیب کہا گیا۔ کچھ ماہرین نے اس تہذیب کے پھیلاؤ اور اس کے اثرات دیکھتے ہوئے اسے وادیِ سندھ کا عہد بھی کہا ہے۔اس تہذیب کا زمانہ 25 سو قبل مسیح قرار پایا جاتا ہے مگر اس کا درست اندازہ ابھی تک نہیں ہو سکا۔ اب تک اس کی پندرہ سو بستیاں دریافت ہو چکی ہیں۔ یہ بستیاں بلوچستان، سندھ، پنجاب، ہریانہ، گجرات، راجستھان اور مغربی اترپردیش میں ملی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وادیِ سندھ کی تہذیب وسیع علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔

وادیِ سندھ کی تہذیب کی ابتدا بھی باقی تہذیبوں کی طرح شہر سے شروع ہوئی مگر وادیِ سندھ کی تہذیب دوسری تہذیبوں سے اس حوالے سے جدا تھی کہ یہاں شہری ریاستیں نہیں تھیں بلکہ اس کے

شہر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ وادی سندھ کی تہذیب کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں سمیری تہذیب اور مصری تہذیب کی طرح عالیشان گھر اور اہرام نہیں تھے بلکہ پبلک عمارتیں بھی سادہ انداز میں تعمیر کی گئی تھیں۔ کیونکہ اس علاقے میں پتھر کی کمی تھی اسلئے عمارتیں اور مکانات اینٹوں سے بنائے گئے تھے۔ کوئی عمارت یا مکان دو منزلہ سے اونچا نہیں تھا۔ جن اینٹوں سے یہ عمارتیں بنائی گئی تھیں ان کی مضبوطی کا یہ عالم تھا کہ ان سے تعمیر شدہ عمارتیں ابھی بھی مضبوطی سے کھڑی ہیں۔ وادیِ سندھ کے شہروں کے دو حصے ہوا کرتے تھے۔ ایک اونچائی پر واقع ہے اور دوسرا نچلا شہر حفاظت کی خاطر دونوں شہروں کو دیواروں اور فصیلوں سے محفوظ کیا جاتا تھا۔

اے مانفرید اپنی کتاب "تاریخ و تہذیبِ عالم" میں لکھتے ہیں کہ:

> "دراوڑی عہد میں ہی اہم شہر عالم وجود میں آ گئے تھے جن میں چوڑی اور سیدھی سڑکیں تھیں اور مکانات دو منزلہ تھے جیسے کہ ہڑپہ اور موہنجوداڑو میں کھدائی کے بعد نکلے ہیں۔ مکانات پکی سرخ اینٹوں کے بنائے جاتے تھے۔ موہنجودڑو میں پانی فراہم کرنے اور گندے پانی کے نکاس کے نظام کے آثار ملے ہیں اور اس بات کے بھی خاصے ثبوت پائے گئے ہیں کہ یہ تجارت اور دستکاری کا ایک بڑا مرکز تھا۔ موہنجودڑو اور ہڑپہ میں بڑے بڑے محلوں کے کھنڈرات ظاہر کرتے ہیں کہ بادشاہوں کے محل تھے، دراوڑی سماج میں ریاستی اقدار کے وجود کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ لیکن اس زمانے میں ہندوستان میں کوئی متحدہ سلطنت قائم نہیں تھی بلکہ وہ بہت ساری سلطنتوں اور راجواڑوں میں تقسیم تھا۔ امراء کے رہنے کے مکانوں اور غریبوں کی بستیوں کے

مکانوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ جائیداد پر مبنی سماجی تفریق موجود تھی۔
طبقاتی سماج اپنی ابتدائی شکل میں نمودار ہو چکا تھا"(20)

وادیِ سندھ کے شہروں میں موہن جودڑو کھدائی کے بعد اپنی اصلی صورت میں سامنے آیا ہے۔ اس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اسے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت بنایا گیا تھا۔ یہ آبادی کی ضروریات کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ شہر کا ایک حصہ بلندی پر واقع ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں اہم لوگوں کی رہائش ہو گی۔ شہر کی شاہراہیں چوڑی اور سیدھی ہیں۔ گلیاں دونوں جانب سے آکر بڑی شاہراہ سے مل جاتی ہیں۔ گندے پانی کی نکاسی کا انتظام بہت عمدہ تھا۔ شہر میں ایک بڑا حمام تھا جب کھدائی کے وقت اس کی شکل سامنے آئی تو معلوم ہوا اس کے اندر حوض ہے جس میں جانے کے لیے سیڑھیاں ہیں۔ حمام کا فرش پکی اینٹوں سے بنایا گیا ہے۔ دیواریں بھی پکی ہیں تاکہ پانی نہ رسے۔ اس کے ارد گرد چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے ہیں۔ کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ یہاں مذہبی رسومات منائی جاتی ہوں گی۔ اس حوض کی خاص بات یہ تھی کہ اس کا انتظام ایسا بنایا گیا تھا کہ اگر پانی خراب ہو جائے تو اسے تبدیل کر دیا جائے۔ شہر میں غلہ محفوظ رکھنے کے لیے گودام تھا۔ خیال یہ ہے کہ یہاں ضرورت سے زائد پیداوار جمع کی جاتی ہو گی اور غلہ یا تو ضرورت کے وقت نکالا جاتا ہو گا یا پھر اس کی تجارت کی جاتی ہو گی۔ شہر میں ایک بڑا ہال ہے۔ شاید یہ مذہبی، سیاسی و سماجی کاموں کے لئے استعمال ہوتا ہو گا۔ یہاں دو ہزار سے لے کر تین ہزار تک مکانات تھے۔ سات سو کنویں تھے۔ آبادی کے بارے میں اندازہ ہے کہ یہ 85000 تک تھی۔

شہر کی اس منصوبہ بندی سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ نفیس ذوق رکھتے تھے۔ صفائی کا خیال رکھا جاتا تھا۔ اسی طرح ہڑپہ کا شہر بھی ایسی ہی منصوبہ بندی سے تعمیر کیا گیا تھا۔ وادیِ سندھ کی بستیوں کی کھدائی کے بعد مٹی کے برتن بڑی تعداد میں ملے ہیں جو کہ آگ پر پکائے گئے تھے۔ یہ برتن مختلف سائزوں میں ہیں۔ ان کو خوبصورت بنانے کے لئے ان پر نقش و نگار بنائے گئے تھے۔ وادیِ سندھ کی بستیوں سے بڑی تعداد

میں مہریں بھی ملی ہیں۔ یہ مٹی، تانبے اور چاندی کی ہیں۔ ان مہروں کی بناوٹ اور استعمال کے بارے میں ماہرین کی رائے یہ ہے کہ انہیں سامانِ تجارت کو محفوظ رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہوگا۔ ان سب کی بناوٹ ایک جیسی ہے۔ اس میں اوپر کی جانب لکھا ہوتا ہے اور اس کے نچلے حصے میں کسی جانور کی تصویر ہوتی ہے۔ جانوروں میں زیبرا، کوہان والا بیل، گینڈا اور ہاتھی ہیں۔

وادی سندھ میں کھدائی کے دوران ایک اہم دریافت روئی سے بنے ہوئے کپڑے کا ایک ٹکڑا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں کپاس کی کاشت ہوتی تھی اور لوگ روئی تیار کر کے اس سے کپڑا بناتے تھے۔ وادیِ سندھ کے آثار سے کئی قسم کے لاتعداد زیورات بھی ملے ہیں۔ زیورات کے علاوہ سرمہ دانیوں کی بھی بڑی تعداد ملی ہے۔ تفریح اور کھیل دو قسم کے ہوتے تھے۔ ایک کھلے میدان میں دوسرے گھروں میں بیٹھ کر کھیلے جانے والے۔ وادی سندھ سے مٹی اور پتھر کے بنے ہوئے پانسے بھی ملے ہیں جو شاید جوا کھیلنے میں استعمال ہوتے ہوں گے یا ان سے قسمت کا حال بتایا جاتا ہوگا۔ اس کے علاوہ شطرنج کے مہرے بھی ملے ہیں۔ تفریح کے لیے یہ لوگ ناچ گانے کو بھی پسند کرتے تھے اس کا ثبوت کانسی سے بنی رقاصہ کی مورتی ہے۔ وادیِ سندھ میں تاجروں کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ تجارت کے لیے وزن اور پیمائش باٹ استعمال کرتے تھے۔ وادیِ سندھ کے قدیم آثار سے وزن کے ایسے باٹ بھی ملے ہیں جو چکور شکل کے پتھر سے بنے ہوئے تھے۔ البتہ سکہ اس وقت ایجاد نہیں ہوا تھا اس لیے اشیاء کا تبادلہ اشیاء سے ہوا کرتا تھا۔

وادیِ سندھ کی آبادی کی اکثریت کسانوں اور کاشتکاروں پر مشتمل تھی جنہوں نے جنگلات کاٹ کر زمین کو کاشت کے قابل بنایا تھا اور پھر دریا سے نہریں نکال کر آبپاشی کے نظام کو قائم کیا تھا۔ سندھ کی بستیوں سے جو فصلوں کے آثار ملے ہیں ان کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہاں گیہوں، باجرہ، دالیں، جو، جوار، چاول اور کپاس وغیرہ پیدا ہوتی تھی۔ وادیِ سندھ کے لوگ مویشی بھی پالتے تھے جن میں بیل، گائے،

بھیڑیں شامل تھیں۔ بیلوں سے وہ ہل بھی چلایا کرتے تھے اور اسے گاڑی میں بھی جوتا جاتا تھا۔ وادیِ سندھ کا معاشرہ طبقات میں بٹ چکا تھا۔ یہ تقسیم دولت، جائیداد، طرز زندگی اور رہن سہن کے حساب سے تھی۔ امیر و غریب کا فرق موجود تھا۔ غلامی کا رواج تھا۔ کسان گاؤں میں رہا کرتے تھے جب کہ خانہ بدوش جنگلوں اور میدانوں میں مویشیوں کے ساتھ پھرا کرتے تھے۔ مردوں اور عورتوں کے درمیان کام کی تقسیم تھی۔ وادیِ سندھ میں لوگ مہروں کو سکے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اندرونی اور بیرونی تجارت کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں پیداوار کی فراوانی تھی۔

وادیِ سندھ کے لوگوں کے مذہب کے متعلق آثار سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں فطرت اور اس کے مظاہر کو پوجا جاتا تھا جن میں درخت اور جانور شامل تھے۔ کچھ مہروں پر دیوتاؤں کی تصاویر بھی ملی ہیں۔ وادیِ سندھ کی تہذیب کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہاں قتل و غارت کے شواہد نہیں ملتے۔ ایسی کوئی تصویر کسی مہر یا دیوار پر نہیں ملی جس میں جنگی مناظر یا جنگی قیدیوں کو دکھایا گیا ہو۔ یا فتح کی یادگار میں کوئی تعمیر کی گئی ہو۔ ہتھیاروں کے بارے میں ضرور معلومات ملی ہیں مگر شاید وہ ان ہتھیاروں کا استعمال آپس کے جھگڑوں میں کرتے ہوں کیونکہ وادیِ سندھ کے لوگوں نے کوئی بڑی ایمپائر نہیں بنائی۔ وادی سندھ کی تہذیب جو ابتدائی طور پر ابھری اور پھیلی 1500 قبل مسیح میں یہ اچانک غائب ہوگئی۔ یہ تہذیب تسلسل کو برقرار نہیں رکھ سکی ابھری اور پھر ڈوب گئی۔ اس تہذیب کا زوال کیوں ہوا اس کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔

کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ فطرت کی آفتوں نے اسے تباہ کر دیا یعنی سیلاب آیا جو شہروں کو اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔ یا زلزلہ آیا جس نے عمارتوں کو زمین بوس کر دیا۔ لیکن سندھ، پنجاب، گجرات اور راجستھان تک تہذیب پھیلی ہوئی تھی۔ سیلاب کا ایک ساتھ آنا اور اتنی بڑی تہذیب کو تباہ و برباد کر دینا ممکن نہیں تھا۔ یہ خیال یہ بھی ہے کہ خشک سالی کی وجہ سے یہ تہذیب تباہ ہوئی۔ جب دریاؤں نے اپنا

راستہ بدلا تو وہ خشک ہوئے اس کی وجہ سے ان کے کناروں پر آباد شہر اجڑ گئے۔ آریا حملہ آوروں کی آمد کو بھی وادیِ سندھ کی تہذیب کے خاتمے کی ایک وجہ سمجھی جاتی ہے۔ ان کے پاس جدید ہتھیار تھے انہوں نے یہاں لوگوں کو غلام بنالیا اور یہ تہذیب تباہ ہو کر رہ گئی۔

حوالہ جات

1– لوئیس معلوف، "المنجد (مرتبہ،اردو عربی) ترجمہ: مولانا عبدالحفیظ بلیاوی "مکتبہ قدوسیہ، ص:104

2– نورالحسن نیّر، مولوی، "نوراللغات"، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 2006ء، ص:339

-3 محمد نعیم ورک، "اردو ناول کا ثقافتی مطالعہ"، کتاب محل داتا دربار مارکیٹ، لاہور، 2019ء، ص:4

-4 عارف فضلِ الٰہی، "فرہنگِ کارواں" مکتبہ کارواں پبلشرز، لاہور، 1962ء

-5 سبطِ حسن، پروفیسر، "پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء" مکتبہ دانیال، لاہور اور اشاعت 14، 2016ء، ص:18

-6 آکسفورڈ انگلش ڈکشنری، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، انگلستان

-7 جمیل جالبی، ڈاکٹر، "پاکستانی کلچر"، مشتاق بک ڈپو، شیلڈن روڈ کراچی، بار اول، 1964ء، ص:48

-8 ول ڈیورنٹ، "انسانی تہذیب کا ارتقاء (مترجم: تنویر جہاں)"، فکشن ہاؤس، لاہور، اشاعت سوم 2004ء، ص:7

-9 سیّد احمد خان، سر، "مقالاتِ سرسید" احمد ندیم قاسمی (ناشر) مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع دوم، نومبر 1990ء، ص:3

-10 ملک حسن اختر، ڈاکٹر، "تہذیب و تحقیق"، یونیورسل بک ڈپو اردو بازار، لاہور، 1985ء، صفحہ:31

-11 مبارک علی، ڈاکٹر، "تہذیب کی کہانی (پتھر کا زمانہ)" سانجھ پبلیکیشنز، لاہور، اشاعت دوم 2008ء، ص:9

-12 مبارک علی، ڈاکٹر، "تہذیب کی کہانی (پتھر کا زمانہ) سانجھ پبلی کیشنز لاہور، اشاعت دوم 2007، ص:46

13- مبارک علی ،ڈاکٹر،"تہذیب کی کہانی (پتھر کا زمانہ)"سانجھ پبلی کیشنز،لاہور،اشاعت دوم 2008ء،ص:23

14- قرآن مجید، سورۃ کہف، آیت:59

15- قرآن مجید، سورۃ طٰہٰ، آیت:95

16- عبدالمجید خان، "دنیا کی قدیم تہذیبیں"، فیکٹ پبلی کیشنز،لاہور، ص:24

17- علی عباس جلال پوری، "روایات، تمدن"، تخلیقات مزنگ روڈ،لاہور، 2013ء, ص:47

18- عبدالمجید خان، "دنیا کی قدیم تہذیبیں"، فیکٹ پبلی کیشنز،لاہور، ص:71

19- محمد ادریس صدیقی، "وادی سندھ کی تہذیب"، فکشن ہاؤس لاہور، 2003ء، ص:38

20- اے مانفرید،"تاریخ و تہذیب عالم (ترجمہ :امیر الدین ، تقی حیدر)"،نگارشات پبلشرز ٹمپل روڈ،لاہور،2020ء، ص:46

باب دوم

راجستھانی تہذیب و ثقافت کا جائزہ

1۔راجستھانی تہذیب و ثقافت کا تعارف:

تہذیب ایک معاشرتی ترتیب ہے۔ یہ کچھ عناصر کے ساتھ مل کر ثقافت کو فروغ دیتی ہے۔ اکثر اہل علم نے جب تہذیب کی تشریح و تعبیر کرنی چاہی تو اسے طرزِ زندگی کا نام دیا۔ طرزِ زندگی میں لوگوں کا رہن سہن، فکر و فلسفہ، علوم و فنون، اصولِ معیشت اور سیاست، شعر و نغمہ، رسوم و عقائد اور زبان و ادب سبھی کچھ شامل ہیں۔ عربی لفظ "تہذیب" سے عام طور پر دُرستی، آراستی، کاٹ چھانٹ، تَراش خَراش کے معنی لیے جاتے ہیں۔

''قاموس مترادفات''میں اس کے معنی درج ذیل ہیں:

> "شائستگی، لیاقت، تمدن، آدمیت، پاکیزگی و صفائی، خوش اخلاقی، اہلیت۔"(1)

تہذیب کے مندرجہ بالا معنی میں تمدن اور ثقافت سے لے کر اعلیٰ انسانی صفات کو سمیٹ لیا گیا ہے۔ ایسے اوصاف کے حامل شخص کو مہذب کہا جاتا ہے یا کلچرڈ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ معنی تہذیب کے دیگر اجزاء کو فراموش کرا دیتے ہیں۔ کیونکہ خد و خال، جغرافیہ، عقائد و افکار، بولی، آلات معاش، سیاست اور سماج وغیرہ مل کر ہی معاشرت بناتے ہیں اور معاشرت ہی تہذیب اور ثقافت کی صورت گری کرتی ہے۔ جب تہذیب، تَمدن، ثَقافت کے الفاظ کو ایک ہی معنی میں استعمال کیا جائے گا تو وہ معروضیت جو اِصطلاحات کے لیے مخصوص ہونی چاہیے باقی نہیں رہے گی۔

ثقافت "کا لفظ بھی عربی زبان سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں "زِیرکی، دَانائی اور کسی کام کے کرنے کی مہارت۔"

اسی لیے مولف قَاموس مترادِفات نے ثقافت کے مفہوم میں تہذیب اور کلچر کے ساتھ خِرد مندی کے الفاظ بھی شامل کیے ہیں۔ سبطِ حسن نے تہذیب و ثقافت کے متعلق صَراحت کے ساتھ لکھا ہے۔اُن کے مطابق:

"کسی معاشرے کی بامقصد تخلیقات اور سماجی اِقدار کے نظام کو تہذیب کہتے ہیں۔ تہذیب معاشرے کی طرزِ فکر و احساس کا جوہر ہوتی ہے ۔ چنانچہ زبان ، آلات و اوزار، پیداوار کے طریقے ، سماجی رشتے ، تمدُن، فنونِ لَطیفہ، فلسفہ و حکمت، علم و آدب ،رسم و روایات، اِخلاق و عادات، عشق و محبت کے سلوک اور خاندانی تعلقات وغیرہ تہذیب کے متعلقہ مظاہر ہیں۔"(2)

مندرجہ بالا بحث و تمحیص کے بعد یہ ثابت ہوا کہ تہذیب یا ثقافت زِندگی سے علیحدہ کوئی چیز نہیں ہوتی۔ یہ داخلی اِقدار کا نام ہے اور ظاہری طور پر طریقہِ زندگی کا بھی۔ ثقافت کسی بھی معاشرے کے لیے رُوح کی حیثیت رکھتی ہے۔ اخلاقی اور معاشرتی، رَسوم، علوم و فنون، عقائد و افکار کے مجموعے کو ثقافت خیال کیا جاتا ہے۔ علاقے کا رہن سہن، میل، جول، اٹھنا بیٹھنا، خاطر تواضع، اندازِ گفتگو، کھیل کُود، آب و ہوا، موسم، شادی بیاہ کے رَسم و رواج، تہوار اور دیگر رسومات بھی ثقافت میں شمار ہوتی ہیں۔ ثقافت اِتحاد کی علامت ہے۔ تہذیب و ثقافت قوم و ملت کے تشخص کا اصل سرچشمہ ہے۔ کسی قوم کی ثقافت اسے باوقار، ترقی یافتہ، قَوی و توانا، علم و دَانش، فنکار اور ہنرمند اور عالمی سطح پر باشرف اور محترم بنا دیتی ہے۔ اگر کوئی ملک یا قوم اپنا ثقافتی تشخص کھو بیٹھے تو وہ قوم اپنے مَفادات کی حفاظت نہیں کر سکے گی۔

ثقافت کے دو حصے ہیں۔

ایک حصہ ان امور اور مسائل سے تعلق رکھتا ہے جو ظاہر اور آشکار ہیں۔ اِن امور کا قوم کے مستقبل اور تقدیر میں بڑا اہم کردار ہوتا ہے۔ البتہ اِس کے اثرات دیر سے ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ امور قوم کی اہم منصوبہ بندیوں میں موثر ہوتے ہیں مثال کے طور پر لباس کیسا ہو؟ کیسے پہنا جائے؟ اور بدن ڈھانپنے کا کون سا انداز اپنایا جائے؟ اسی طرح کسی علاقے میں تعمیر کا انداز کیا ہے؟ گھر کس طرح بنائے جاتے ہیں؟ رہن سہن کا طریقہ کیا ہے؟ یہ چیزیں تہذیب کے ظاہر و آشکار امور میں شمار ہوتی ہیں اور معاشرے کی ثقافت کا آئینہ ہے۔

عوامی ثقافت کا دوسرا حصہ اِخلاقیات پر مبنی ہے یعنی معاشرے کے افراد کی ذاتی اور سماجی زندگی کا طور طریقہ کیا ہے۔ یہ حصہ بھی پہلے حصے کی طرح ایک قوم کی تقدیر طے کرنے میں موثر کردار ادا کرتا ہے۔ اِس کے اثرات فوری طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ اِن اثرات کو باآسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ثقافتی امور خود تو نمایاں اور واضح ہیں لیکن اِن کے دیر پا اثرات معاشرے کی ترقی اور اِن کی تقدیر کے تعین میں بہت نمایاں ہوتے ہیں۔ ثقافت معاشرے کے پیکر میں روح اور جان کا درجہ رکھتی ہے۔ قوموں پر تَسلط اور غلبے کے لئے اَغیار اپنی تہذیب و ثقافت کی ترقی و ترویج کی کوشش کرتے ہیں جو کوئی نیا طریقہ نہیں بلکہ زمانۂ قدیم سے رائج ہے۔ دنیا کی تمام بیدار قومیں اِس بات پر متفق ہیں کہ اگر کسی قوم نے اپنی ثقافت کو بیگانہ ثقافتوں کی یلغار کا نشانہ بننے سے نہ روکا تو تباہی اور بربادی کے ساتھ نابودی اس قوم کا مقدر بن جائے گی۔ تاریخ گواہ ہے غلبہ اسی کو حاصل ہوا جس کی ثقافت غالب رہی۔ تہذیب و ثقافت کا غلبہ سیاسی، اِقتصادی اور فوجی غلبے کی مانند ہمہ گیر برتری کا پیش خیمہ ہے۔

ثقافتی تسلط اقتصادی اور سیاسی تسلط سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ اس لیے کہ اگر ایک قوم نے دوسری قوم پر تہذیبی و ثقافتی غلبہ حاصل کر لیا تو اُس کا قومی تشخص ختم ہو جاتا ہے۔ اگر کسی قوم کو اُس کے

ماضی، اُس کی تاریخ، اُس کے تشخص، اُس کے افتخارات سے دور کر دیا جائے، اُن کے سیاسی، علمی، مذہبی، قومی اور ثقافتی افتخارات کو ذہنوں سے محو کر دیا جائے، اُن کی زبان کو زوال کی جانب دھکیل دیا جائے، اُن کے رَسم الخط کو ختم کر دیا جائے تو وہ قوم اغیار کی مرضی کے مطابق ڈھل جانے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔

راجستھانی تہذیب عہد بہ عہد ایک جائزہ:

تہذیب اور ثقافتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو بَرصغیر پاک و ہند کی سرزمین بہت زرخیز رہی ہے۔ اس نے اپنی کوکھ سے کئی تہذیبوں اور ثقافتوں کو جنم دیا۔ ول ڈیورنٹ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ''قدیم سندھی تہذیب دنیا کی قدیم ترین تہذیب ہے''۔(3)

کائنات ایک موجودہ حقیقت ہے اور اس کے تمام مظاہر اپنی صُورت پذیری کرتے ہوئے انسانی احساسات کو کیف و سُرور بخشتے ہیں۔ یہ مظاہر مذہبی، اساطیری یا رومانوی قصے کہانیوں کی صورت میں سامنے آسکتے ہیں۔ لیکن اِن کی مادی صُورت گری اِن کے وجود کو اِستحکام بخشتی ہے۔ انسانی سماج کے ارتقا سے تہذیب و تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو راجستھانی تہذیب کا عہد بہ عہد جائزہ لے کر اسے ہم ایک مضبوط اور وُسعت پذیر تہذیب ثابت کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے راجستھانی تہذیب کے عمیق مطالعہ کے دوران اس بات کا قوی امکان موجود ہے کہ اِس جاندار تہذیب و ثقافت کا ارتقائی سلسلہ، زبان و مکان کی بہت سی شہادتوں کو ہمارے سامنے لے کر آئے گا۔

انسانی تاریخ وقت کے پروں پر سوار صدیوں اور قَرنوں کا سفر طے کرتے ہوئے عصرِ حاضر تک آن پہنچا ہے۔ اپنی بقا کے لیے فطرت کے مقابل انسان کی تگ و دو ازل سے ہی جاری ہے۔ فطرت کے مقابل بقا کی اس جنگ میں انسان ہمیشہ عدم تحفظ اور شدید احساسِ کمتری میں مبتلا رہا ہے۔ یہی وہ خوف ہے جو غاروں کے عہد سے لے کر آج سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور تک انسانوں کے متوازی سفر کرتا رہا ہے۔ ترقی کی خواہش نے انسان کو فطرت کی تسخیر پر اکسایا۔ انسان نے اپنے موجود اور وجود کو احساس مانتے

ہوئے اپنی شخصی تراش خراش کی، اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھایا اور تہذیب و تمدن کی بنیاد رکھی۔ یہ بنیاد کہیں مذہب پر رکھی گئی اور کہیں زبان و بیان اس کا پیش خیمہ ہے۔ تاریخ کے اُوراق میں ہمارے لئے مختلف تہذیبیں اپنی زندہ روایات کے ساتھ جگمگا رہی ہیں۔

قرآن کریم میں ایک جگہ اِرشاد باری تعالیٰ ہے:

"یَآ اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنَاکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللهِ اَتْقَاکُمْ ۴"

ترجمہ: " اے انسانوں ہم نے تمہاری برادریاں اور قبیلے تمہاری جان پہچان کے لیے بنائے۔ بے شک اللہ کے یہاں تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہے۔"(4)

یہ آیتِ مُبارکہ انسان کی مختلف تہذیبوں، گروہوں اور رنگ و نسل میں تقسیم کا مستند حوالہ ہے۔ اِسی طرح زبان یا بولی وہ غالب عنصر ہے جس سے کسی فرد یا قوم کو شناخت ملتی ہے۔ اِس آیت کی روشنی میں ہم ماضی کی تہذیبوں پر نظر ڈالیں اور قوموں کے حالیہ ثقافتی مظاہر کو دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عربی، فارسی، سنسکرت، راجستھانی، مارواڑی، سندھی، بلوچی، پُوٹھوہاری، بَراہوی تہذیبوں کا اپنا ایک تشخص ہے۔ یہی تشخص اِنہیں بحیثیت تہذیب باقیوں سے ممتاز کرتا ہے۔ راجستھانی تہذیب کے نقوش کو ڈھونڈنے کے لئے ہمیں ماضی بعید کے جھروکوں میں جھانکنا ہوگا۔

کسی بھی گم گشتہ تہذیب اور اس کی جزئیات کو موجودہ عہد میں تلاش کرنے کے لیے تاریخی تعاملات و مضمرات کی جائزہ نگاری ضروری قرار پاتی ہے۔ ''اردو ادب میں تاریخیت'' کے ابتدائیہ میں ڈاکٹر ناہید قمر کا کہنا ہے کہ:

> "تاریخ سے رشتہ قائم کرنے کے لیے ہمارے پاس کئی زاویے ہوتے ہیں۔ ایک تماشائی، ایک واقعہ نویس، ایک غیر جذباتی مورخ، یا ایک عقیدت مند زائر کے طور پر اپنی جانچ پڑتال کرتا ہے۔ یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم تاریخ کے تعامل کے لیے کون سا زاویہ اختیار کرتے ہیں۔ ثقافت اور تہذیب و تاریخ کا مطالعہ بنیادی طور پر انسانی زندگی کی وحدت کا مطالعہ ہے اس وحدت کی تعمیر کسی تہذیب کے شہود عناصر کے ساتھ ساتھ اس کے ذہنی اور تحریری عناصر دونوں کے وسیلے سے ہوتے ہیں۔ ہماری تہذیب کی جس ذہنی فضا میں تشکیل ہوئی اس کی سطحیں، زاویے، سرچشمے اور وسائل متنوع ہیں۔ لیکن ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ جس طرح اپنے عہد اور اپنی تاریخ کو ہم تاریخ کے دائرے سے باہر آکر دیکھ سکتے ہیں ۔اسی طرح اپنی تہذیب و تاریخ کو بھی کسی ایک عرصے، دور یا نظریہ تک محدود نہیں کر سکتے۔ تاریخ کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ ہمارا تہذیبی تناظر بھی تبدیل ہوتا رہتا ہے مگر اس کی تقسیم کے لیے جو کشادہ فکری اور بے تعصبی درکار ہے وہ ہماری علمی روح میں مفقود ہے"(5)

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں ہم راجستھانی تہذیب و ثقافت کے نقوش تلاش کریں تو سب سے پہلے ہمیں اس کی شناخت یا تعریف کے مرحلے سے گزرنا پڑے گا۔ راجستھانی قدیم ہندوستانی تہذیب ہے۔ اسے ساٹھ صدیوں کی قدیم تہذیب قرار دیا جاتا ہے۔ اگر تحقیقی اور مدلل انداز فکر اپنایا جائے تو راجستھانی تہذیب تاریخی شواہد کی متقاضی ہے۔ بحث سے علمی گفتگو ہو سکتی ہے نہ کسی نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے۔ آج کا نیا، کل کے لیے پرانا ہو جاتا ہے۔ اس لیے تحقیق ایسا راستہ ہے جس پر مسافر کو چاہیے کہ مسلسل چلتا رہے۔ یہی احساس مسافر کو مہمیز کرتا ہے اور نوادرات سے مسافر کا دامن مالا مال ہو جاتا ہے۔

رَد و قبول تحقیق کا ایک اہم حصہ ہے لیکن اس کے لیے تاریخ اور مآخذات کے حوالوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تحقیق ہوا میں تیر چلانے کا نام نہیں ہے۔ علم جب بولتا ہے تو اپنی اَفادیت ثابت کر دیتا ہے۔ تہذیب کو جُغرافیائی، سماجی، سیاسی اور ادبی تناظر میں دیکھتے ہیں۔

راجستھان کی تاریخ صدیوں پرانی ہے۔ موجودہ بھارت کی ریاست راجستھان وادی سندھ کی تہذیب کا حصہ رہی ہے۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ عراقی تہذیب سے بھی قدیم ہے اور اپنی الگ شناخت رکھتی ہے۔ وقت کو انسانی آنکھ کے دیکھے بھالے خوابوں کا منظر نامہ کہیں تو بے جا نہ ہو گا۔ یہ خواب تاریخ کے گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں خود نمائی کا ذریعہ بنتے ہیں تو کہیں ریت میں دفن نقوش کی صورت مرقع عبرت دکھائی دیتے ہیں۔ تاریخ کے یہی اُوراق اِجتماعی شعور اور خود شناسی کے معنی و مفہوم واضح کرنے کی لغت کا کام بھی دیتے ہیں۔

راجستھانی تہذیب کی بازیافت کے حوالے سے تاریخ کے فکری نظام میں تہہ در تہہ پنہاں نقوش نہ تو ہمارے لئے جامد ہیں اور نہ ہی خارجی سطح پر ان سے انحراف کی روایت موجود ہے۔ زندگی کے دیگر مظاہر کی طرح راجستھانی تہذیب کے گم گشتہ خزانے ہماری توجہ اور دلچسپی کے منتظر ہیں۔ راجستھانی تہذیب کا ماضی شاندار اور بیش قیمت اسلوب کا حامل ہے۔ اسے جدید طرزِ فکر کی چھلنی سے گزار کر مستقبل میں تہذیبی ورثے کی معدومیت کے امکانات کو ختم کرنے کی سَعی کی جاسکتی ہے۔ راجستھانی تہذیب و ثقافت ہندوستان کی تاریخ کے روشن لمحات کے گرد اپنے احساسات کی چلہ کشی کے عمل سے گزر رہی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی اس حوالے سے کہتے ہیں:

> "کسی قوم کی تہذیب بھی ایک دریا کی مانند ہے جو وقت کے ساتھ بدلتی
> اور نئے عناصر کو اپنے اندر شامل کرتی ہوئی آگے بڑھتی رہتی ہے۔ قوم اور

تہذیب تو بظاہر ویسے ہی رہتی ہے لیکن زمانے کے اثرات اس کے مزاج
کو ایک نیا رنگ، ایک نیا رخ دے دیتے ہیں۔"(6)

جمیل جالبی کی آراء کی روشنی میں راجستھانی تہذیب و ثقافت کے خدوخال واضح کریں تو طوفان نوح علیہ السلام کے بعد موجود وقت تک اس تہذیب نے علم و ہنر اور کمال فن کے بہت سے زینے طے کیے ہیں۔ فرد نے مُعاشی اِکائیوں کے ساتھ اشتراکِ عمل کرتے ہوئے آدمی کے تہذیبی شعور کو پروان چڑھایا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ زندگی کی تمام مسرت اِسی عمل سے ظہور پذیر ہوتی ہے۔اِس جدوجہد کے نتیجے میں ہر سطح پر ترقی اور خوشحالی کے در وا ہوتے ہیں اور تمدنی مظاہر کو فروغ ملتا ہے۔ اگر عمل کی راہوں کو مَسدود کر دیا جائے اور تغیر و تبدل کو حقیقت پسندی کے سانچے سے جانچا اور پرکھا نہ جائے تو ترقی و خوشحالی کا سفر رک جاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

"وہ تہذیب جو تغیر سے ناآشنا ہو تاریخ سے بھی ناآشنا رہتی ہے۔ مگر تاریخ
صرف واقعات کا ڈھیر نہیں بلکہ اس کے پیچھے ایک ایسے تناظر کا ہونا بھی
لازم ہے جس کی نسبت اس کی پہچان ہو سکے۔ وقت کے گزرنے کا
احساس تاریخی شعور کی اہم ترین شرط ہے۔"(7)

تاریخ میں سب سے پہلے مورخ کا اعزاز پانے والے یونانی "ہیروڈوٹس" نے جب تاریخ پر کتاب لکھی تو اُس کا مواد اُس کے تجربات و مشاہدات، تجزیات کے علاوہ اُن زبانی واقعات پر بھی تھا جو اُس نے اپنی سیاحت کے دوران ایران اور مصر سے معلومات کی صورت اکٹھا کیا تھا۔ اُس نے اپنی کتاب میں تاریخ نویسی کے مقاصد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ماضی کے واقعات کو محفوظ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قوموں اور افراد نے جو کارنامے سرانجام دیے ہیں ان کو محفوظ رکھا جائے تاکہ آنے والی نسلیں ان سے سبق سیکھیں اور فائدہ اٹھائیں۔

راجستھانی تہذیب کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو تاریخی تناظرات میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہندوستان وسیع و عریض علاقے پر مشتمل ہے اور اس کی سرحدیں روس، ایران، چین اور بحیرہ عرب سے ملتی ہیں۔ اپنی جُغرافیائی حدود اور محل وقوع کے باعث یہ علاقہ بیرونی حملہ آوروں، تاجروں، سیاحوں اور زائرین کی بدولت آمدورفت سے متاثر ہوتا آیا ہے۔

ہندوستان میں رہنے والوں کی تہذیب ایک ہی خطے میں رہنے کے باوجود مختلف ہے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ علاقوں کی ثقافت اور خصوصیات، تہذیب، آب و ہوا اور ماحول کے باعث الگ الگ ہے۔ دیکھا جائے تو ہندوستانی تمدن ایک مخلوط تمدن ہے۔ جس کا خمیر مختلف قومیتوں اور مذاہب کے نظریات و افکار سے اٹھایا گیا ہے۔ ماہرین ہندوستانی تہذیب کو اتنا ہی قدیم گردانتے ہیں جتنی کہ خود تاریخ ہے۔ اس سلسلے میں آثار قدیمہ کے جُملہ ماہرین متفق ہیں کہ وادی سندھ کی تہذیب ہی قدیم ترین تہذیب ہے۔

راجستھانی تہذیب:

آثار قدیمہ پر لکھی گئی کتابوں کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ راجستھان کی سرزمین کئی ہزار سالوں سے آباد ہے۔ واضح طور پر اِس کا سراغ وادی سندھ کی تہذیب میں ملتا ہے۔ ہڑپہ زمانے کے لوگ سب سے پہلے دریائے سرسوتی کے پشتے پر آباد ہوئے تھے جو راجستھان میں اراوئی پہاڑی سلسلے سے شروع ہوا تھا۔ تاہم اِس خطے میں آب و ہوا کی شدید تبدیلیوں اور سیلاب کے باعث کئی بار آبادیوں کا خاتمہ ہوا۔ عہد وسطیٰ میں مغلیہ سلطنت کا عروج ہوا اور مغلوں نے راجپوتوں کو بڑے عہدوں سے نوازا اور راجستھان کی راجپوتانہ ریاستوں سے اِتحاد قائم کر لیا۔ البتہ کچھ راجپوت ریاستوں نے مغلوں کی دوستی کو قبول نہ کیا اور ہمیشہ اُن سے برسرِپیکار رہے۔ اٹھارویں صدی میں مغل زوال کا شکار ہوئے تو اُن کا تسلط ہلکا ہو گیا اور خطے کے زیادہ تر حصے کو مرہٹہ سلطنت نے اپنی حکومت میں ملا لیا لیکن مرہٹہ سلطنت کو حکومت راس نہ آئی اور بہت جلد تمام علاقے برطانوی راج کے زیر سایہ آ گئے۔ برطانیہ نے بھی مختلف ریاستوں

کے ساتھ اتحاد قائم کر لیا اور نوابی ریاستوں کو باقی رکھا۔ یہ زمانہ قحط سالی، معاشی عدم استحکام کا زمانہ تھا۔ تقسیم سے پہلے صوبہ راجستھان، راجپوتانہ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اِس علاقے کی قدیم تاریخ پر نگاہ دوڑائیں تو راجستھان کے باندی ضلع اور بھیلواڑہ ضلع میں 5000ء تا 6000ء سال پرانے آثار ملے ہیں۔ (8)

موجودہ جھنجھنو، سیکر شہر، جے پور اور دیگر شہر جن کی سرحدیں ہریانہ سے ملتی ہیں قدیم ویدک ریاست برہم بھرت نگر کا حصہ تھیں۔ وَیدک کی دیگر ریاستیں مہندر گڑھ اور ریواری تھیں۔ یہیں سے وَیدک فنون کی شروعات ہوئی اور سناتن اور دھرم کا آغاز ہوا۔ سناتن اور دھرم ہی موجودہ ہندومت کی بنیادیں ہیں۔ سب سے پہلے سرسوتی *[1] اور درشوتی ندیاں بنیں اور اس کے بعد برہم ورت ریاست قائم ہوئی۔ درشوتی ندی کو بھاگونے ویدک درشوتی کہا ہے۔ راجستھان کے کچھ علاقے وادیِ سندھ کی تہذیب میں ہڑپہ کے زیرِ نگیں رہے۔

1918ء میں شمالی وزیرستان کے کالی بنگا میں کُھدائی کے دوران ایسی نشانیاں ملی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہاں ایک ندی تھی جو اب خشک ہو چکی ہے۔ اور اُس ندی کے ساحل پر ہڑپہ کی بستیاں آباد تھیں۔ کچھ لوگ اسے سرسوتی ندی کہتے ہیں۔ ماہرینِ آثار قدیمہ کا ماننا ہے کہ سرسوتی کے ذریعے ماضی بعید کے کئی راز افشا ہو سکتے ہیں۔ راجستھان کا جغرافیہ ہی کچھ ایسا ہے کہ کئی بادشاہوں نے اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے لیے اِدھر کا رخ کیا۔ راجستھان 321ء تا 184ء قبل مسیح موریہ سلطنت کا حصہ بھی رہ چکا ہے۔ راجپوتانہ کا مطلب ہے بادشاہوں کی سرزمین۔ "تھر *"[2] نامی بڑے پیمانے پر صحرا کا احاطہ

1۔ سرسوتی *: ایک گمشدہ دریا۔ جس کا اب وجود نہیں رہا جو اس صحرائی علاقے میں کبھی بہتا تھا۔ تاریخی کتب میں لکھا ہے کہ 600ء قبل مسیح تک یہ دریا علاقے کو سیراب کرتا رہا ہے۔ ہندوؤں کے ویدک عید میں اس کا نام موجود ہے

2۔ تھر *: صحرائے تھر پاکستان کی جنوب مشرقی اور ہندستان کی شمال مغربی سرحد پر واقع ہے۔ اس کا رقبہ 200,000 مربع کلومیٹر یا 77,000 مربع میل ہے۔ اس کا شمار دنیا کے نویں بڑے صحرا کے طور پر کیا جاتا ہے

کرنے کے باوجود راجستھان ایک مشہور سیاحتی مقام ہے۔ ریت کے ٹیلوں، صحراؤں اور پتھروں کی سرزمین راجستھان اپنی سنہری تاریخ میں شجاعت و بہادری کی متعدد کہانیوں کا حامل ہے۔ اِس خطے پر وقتاً فوقتاً چوہان، پرمار، مرواڑ، راٹھور اور گہلوٹ خاندانوں کا راج رہا ہے۔ میواڑ، مروار، جے پور، بنڈی کوٹہ، بھرت پور اور ایوار اہم سلطنتیں تھیں۔ مغل اور بیرونی حملہ آوروں کے بہت سارے حملوں نے راجستھان کی تاریخ شجاعت اور بہادری کی داستانوں سے پُر کر دی ہے۔ پرتھوی راج اور مہاراجہ پرتاب سے لے کر رانا سانگا اور رانا کمبھا جیسے بادشاہوں نے خود اعتمادی کی جنگ میں اس کی تاریخ کو بچایا جبکہ رنتھمبور، چتوڑ، خانوا سے لے کر وادی ہلدی تک کئی تاریخی جنگیں بھی اِسی سرزمین پر لڑی گئیں۔

راجپوتانہ تقریباً دو درجن علاقائی ریاستوں کے علاوہ مختلف جاگیروں پر مشتمل تھا۔ اِن میں ایسی جاگیریں بھی شامل تھیں جن کو ریاستی حیثیت حاصل تھی۔ تقسیم کے بعد صوبہ راجستھان کی تشکیل کا عمل شروع ہوا تو راجپوتانہ کی تمام قدیم ریاستیں اور جاگیریں بھی اس میں شامل کر دی گئی۔

مارچ 1940ء کو موجودہ صوبہ راجستھان کی تشکیل عمل میں آئی۔ تمام ریاستوں کا حکومتی نظام ختم کر کے جمہوری نظام کی بنیاد رکھی گئی۔ راجستھان، رقبے کے لحاظ سے ہندوستان کی بڑی ریاستوں میں سے ہے جو اپنی قدیم تہذیب اور رنگین ثقافت کی بنا پر پہچانی جاتی ہے۔ راجستھان اپنے عمدہ فنِ تعمیر، متحرک اور رنگا رنگ ثقافت، خوبصورت دستکاریوں، قلعوں، محلوں، لوک رقص اور پکوانوں کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ راجستھان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہاں ہر تھوڑے فاصلے پر زبان کا انداز بدل جاتا ہے۔ راجستھان میں بولی جانے والی زبان میں بہت سارے لوک گیت، موسیقی، رقص، ڈرامے اور کہانیاں دستیاب ہیں۔ اِس زبان کو آئینی طور پر تسلیم نہیں کیا گیا اس وجہ سے اِسے تعلیمی اداروں میں نہیں پڑھایا جاتا جس کے نتیجے میں یہ زبان بتدریج زوال کی طرف گامزن ہے۔ راجستھان جو شورویروں کی سرزمین کہلاتی ہے پوری دنیا میں اپنے فنون، تاریخی ورثے اور ثقافت کے باعث ایک درجہ رکھتی ہے۔

راجستھان کا نام ذہن میں آتے ہی شاندار محلات، ناقابل تسخیر قلعوں، خوبصورت جھیلوں، سر سبز باغات، پوشاکوں، زیورات، اونٹوں، ہاتھیوں اور صحرا کی تصویر نگاہوں کے سامنے لہرانے لگتی ہیں۔اِن تصاویر سے سیاحوں کے تجسس کو ہوا ملتی ہے۔پوری دنیا میں کوئی دوسری جگہ نہیں جو اپنی متحرک ثقافت کی دولت سے مالا مال ہو۔راجستھان کی تاریخ عظیم ہونے کے ساتھ ساتھ رنگین بھی ہے۔اس میں ایک متحرک ثقافت رواں دواں ہے راجستھان کی اپنی ترقی یافتہ اور قدیم موسیقی ہے۔ مخصوص ملبوسات اور رقص ہیں۔ کالب سے لیہ اور اُدئے پور کے گھومر پوری دنیا میں مشہور ہیں۔راجستھانی لباس میں کشیدہ کاری اور شیشے کا کام ہوتا ہے راجستھان میں میلہ مویشیاں اجمیر کے قصبے پیشکر میں ہوتا ہے جو پوری دنیا میں مشہور ہے۔

یہ قصبہ پیشکر جھیل کے کنارے واقع ہے۔ میلہ مویشیاں ہر سال نومبر میں لگایا جاتا ہے جہاں مویشی خریدے جاتے ہیں۔پوری دنیا سے سیاح یہاں منعقد کی جانے والی اونٹ دوڑ دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ جیسلمیر شہر صحرا میں اونٹوں کی سواری کی وجہ سے سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے تو جے پور کے شاندار قلعے اور محلات مشہور ہیں۔اُدے پور کو خوبصورت جھیلوں کی بدولت مشرق وسطی کا وینس کہا جاتا ہے۔ مندروں اور گھاٹوں سے بھرا ہوا پشکر بھی یہیں موجود ہے۔یہ دنیا کا واحد مقام ہے جس میں ہندوؤں کے خدا برہما کے لیے ایک ہیکل ہے۔ یہ اپنے عمدہ فنِ تعمیر کی بدولت زائرین کو اپنی طرف راغب کرتا ہے۔ یہاں جین مندر ہیں جو گیارہویں اور بارہویں صدی میں تعمیر ہوئے تھے۔اگر آپ جنگلی حیات میں دلچسپی رکھتے ہیں توراجستھان کے شہر بھرت پور سارسیکا اور رنتھمبور میں آپ کے لیے بہت کچھ ہے۔سارسیکا نیشنل پارک آپ کو شیروں اور جانوروں کی بہت سی اقسام دیکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ گھنے جنگلات میں کیولاڈیو (بھگوان شیوا) کے لیے وقف ایک مندر ہے۔ نیشنل پارک جنگلوں، جھیلوں، گھاٹیوں کی وجہ سے ایڈونچر کے شوقین لوگوں کے لئے دلچسپی کی جگہ ہے۔راجستھانی گانے

پورے ہندوستان میں مشہور ہیں۔ یہاں کی مٹھائیاں پوری دنیا میں مشہور ہیں۔ راجستھان کی سب سے مشہور ڈش دال باٹی اور کرما ہے۔ اس کے علاوہ بیکانیری بھوجنیہ، جودھ پور کے مواکاچوری، بیکانیر ش گولا اور جے پور کے گیور مشہور ہیں۔ راجستھان روایتی زیورات کے لیے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ یہ زیورات زیادہ تر چاندی سے بنائے جاتے ہیں۔ جے پور سے نکلے ہوئے سونے سے بنے زیورات میں رنگارنگ پتھر جن میں کندن اور زرکون شامل ہیں، مرصع کیے جاتے ہیں۔

اِن زیورات کو پوری دنیا کی خواتین پسند کرتی ہیں۔ "تیورا" راجستھان کے پرتاب گڑھ کا ایک اور زیورات سے متعلق مقام ہے جو پورے ہندوستان میں مشہور ہے۔ جے پور کی پتھر کاٹنے کی صنعت اپنی مثال آپ ہے۔ ہنر مند کاریگر خوبصورت پتھر جیسے روبی، نیلم، زرکون وغیرہ کاٹ کر خوبصورت شکل دیتے ہیں اور پالش وغیرہ کرتے ہیں۔ راجستھان کے نیلے رنگ کے برتن نہایت چمکدار ہوتے ہیں۔ یہ فلر کی زمین سے بنائے جاتے ہیں اور اِنہیں کم آگ پر پکایا جاتا ہے۔ اِن پر زیادہ تر پودوں جانوروں اور پرندوں کی شکلیں بنائی جاتی ہیں۔ الغرض راجستھان اپنی رنگارنگ تہذیب و ثقافت رسم و رواج مذہبی تہواروں اور سیاحتی مقامات کے باعث شہروں میں بلند حیثیت کا حامل ہے۔

راجستھان کا ادبی سیاسی اور سماجی جائزہ:

تاریخ میں ڈھونڈھاراج کے نام سے کچھوایہ خاندان کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہ راجپوت بہت بہادر اور معاملہ فہم تھے۔ ان کی راجدھانی قصبہ آمیر تھی۔ یہاں کے مہاراجہ بھارمل نے 1547ء میں اکبرِ اعظم سے اپنی بیٹی جیارانی کا رشتہ طے کر کے پورے ہندوستان میں راجپوتوں کی دھاک بٹھادی۔ اکبر نے جیارانی کو "عارف النساء" بیگم کے خطاب سے نوازا۔ یہ پہلی راجپوت خاتون تھی جسے سلطنتِ مغلیہ کی حرم سرا میں شامل ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ اِسی رشتے داری نے ریاست جے پور میں فارسی زبان و ادب کو فروغ دیا اور مرکز میں خط و کتابت کے لئے فارسی زبان استعمال کی جانے لگی۔ (9)

والیانِ ریاست کی دلچسپی کے باعث یہاں فارسی زبان وادب کی نمایاں ترویج ہوئی۔ ان کی دیکھا دیکھی عوام بھی دلچسپی لینے لگے اور سرکاری دفاتر میں بھی فارسی کا استعمال ہونے لگا۔

مولانا عبدالحق نے تحریر کیا ہے کہ:

"جے پور میں ابتداً تمام ہندوستان کی طرح فارسی زبان دفتروں میں رائج ہوئی تھی۔"(10)

جے پور شہر میں فارسی کے اثرات واضح اور نمایاں نظر آنے لگے اور شہر جے پور کو ریاست آمیر کی راجدھانی بنادیا گیا۔ شہر جے پور بسانے والا راجا سوائی سنگھ (1699ء تا 1743ء) مختلف علوم وفنون کا قدردان تھا۔ اُسی زمانے میں دہلی میں اردو زبان بول چال سے نکل کر شعر و سخن کی حدود میں قدم رکھ رہی تھی اردو بولنے والے افراد کی جے پور ریاست آمدورفت بڑھنے سے یہاں بتدریج اردو جڑیں پکڑنے لگی۔ صُوفیائے کرام نے تالیف و تصانیف کو اُس عورت سے منسوب کیا جو شاہ جہاں کی ماں بنیں اور انہیں جودھابائی کے نام سے جانا جاتا ہے۔(11)

ریاست جودھ پور میں فارسی زبان کو اِتنا فروغ حاصل ہوا کہ اٹھارویں صدی آتے آتے غیر مسلم حضرات بھی فارسی میں دسترس حاصل کرنے لگے۔ انیسویں صدی میں ناگور میں خواجہ نجم الدین نجم فاروقی اردو اور فارسی کے صاحب دیوان شاعر ہوئے۔ اردو کے آغاز وارتقاء کے سلسلے میں ڈیڈوانہ، میڑتہ اور کھاٹو کا ذکر نہ کرنا منافقت ہوگی۔ خاص طور پر کھاٹو تو وہ خاندان ہے جس میں پروفیسر محمود شیرانی جیسا محقق، مورخ اور نقاد عالم و فاضل پیدا ہوا جس نے ٹونک کو اپنا مسکن بنایا اور لاہور پہنچ کر اپنی تصانیف و تالیف کے ذریعے دنیائے ادب میں مشہور و معروف ہوئے اور اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ انیسویں صدی ختم ہوتے ہوتے جودھ پور میں شعر و سخن کا خاص ماحول قائم ہو چکا تھا۔ اِس علاقے میں نہ

صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم حضرات نے بھی شعر و ادب کے فروغ کے سلسلے میں اپنا حصہ ڈالا۔ عظیم بیگ چغتائی اور عصمت چغتائی کا تعلق بھی جودھ پور سے رہا۔

تشکیل راجستھان کے بعد جودھ پور کو ضلع کی حیثیت حاصل ہوئی اور آہستہ آہستہ بہت سے بیرونی حضرات جو شعر و ادب سے دلچسپی رکھتے تھے بسلسلہ ملازمت اور تلاشِ معاش میں یہاں پہنچے اور ادبی سرمائے میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ مقامی لوگ بھی ابھر کر سامنے آئے۔ جودھ پور کے باذوق حضرات کی کوششوں سے ۱۹۵۶ء میں شاہ گوردھن لال کی صدارت میں انجمنِ ترقیِ اردو راجستھان کی ایک شاخ جودھ پور میں قائم کی گئی تھی۔ جس کے زیر اہتمام دوسری ادبی تخلیقات کے علاوہ 13 تا 15 نومبر 1923ء ایک کل راجستھان اردو سمپوزیم بعنوان اردو ادب کے نو سال اور کل ہند مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ اس کی ضخیم روداد وحید اللہ خان وحید نے مرتب کر کے 1924ء میں دہلی پرنٹنگ پریس رامپور سے طبع کرا کے شائع کروائی۔ اِس روداد میں سمپوزیم کے تمام مقالات اور شعراء کی غزلیات وغیرہ شامل ہیں جو راجستھان کی ادبی اور سماجی تاریخ میں ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ریاست ٹونک:

راجستھان کی ریاستوں میں 1757ء سے پہلے اردو شعر و ادب کا آغاز ہو چکا تھا۔ اِس میں ریاست ٹونک کا نام قابل ذکر ہے۔ نواب امیر الدولہ کے فرزند نواب وزیر الدولہ کا عہد علمی و ادبی لحاظ سے عہدِ زریں مانا جاتا ہے۔ ہنگامہ غدر کے بعد کچھ صاحب فضل و کمال خود ٹونک پہنچے اور کچھ کو نواب نے خود دعوت دے کر بلوایا۔ غرض ٹونک ایک عالمی مرکز بن گیا اور تصنیف و تالیف کے لحاظ سے اس کا مرتبہ راجپوتانہ میں بہت بلند ہو گیا۔ نواب نے ایک عمدہ کتاب خانہ اس دور کے رواج کے مطابق تیار کرایا اس کو 1954ء مولانا آزاد نے خرید کر نیشنل لائبریری دہلی میں ضم کر دیا۔ نواب وزیر الدولہ کے فرزند نے بھی علم و ادب کی خدمت کا سلسلہ جاری رکھا نواب محمد علی خان کے دور میں فارسی کی جگہ اردو

زبان سرکاری زبان قرار پائی۔ ۱۸۹۷ء میں منشی کا کھا پرشاد نے پریس جاری کیا۔ جس میں اردو اور فارسی کی کتابیں چھپتی تھیں۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کا تعلق بھی ریاست ٹونک سے تھا۔ 1950ء میں ریاست ٹونک راجستھان میں ضم کردی گئی اور ٹونک کو ضلع بنادیا گیا۔

ریاست جھالاواڑ:

1831ء میں ریاست قائم ہوئی۔ رانا پرتھوی سنگھ کے عہد 1875ء تا 1845ء میں فارسی کے ساتھ اردو بھی استعمال ہونے لگی اور 1842ء میں اردو کا ایک پریس بھی کام کرنے لگا۔ مہاراجوں کی سرپرستی کے باعث جھالاواڑ ایک چھوٹا سا مرکز علم وادب بن گیا تھا۔

ریاست الور:

جن ریاستوں کی سرحدیں دہلی اور آگرہ کے قریب تھیں۔ راجستھان کے ان علاقوں میں دہلی کے ادبی اثرات 1857 سے پہلے قائم ہو چکے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ سماجی اثرات بھی دیکھنے کو مل رہے تھے۔ اِس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی رہی کہ ایسی ریاستوں کے علاقوں میں مسلمانوں کی آمد ورفت کا سلسلہ اس وقت سے قائم ہو چکا تھا۔ جب ریاستوں کا وجود بھی عمل میں نہ آیا تھا اِن ریاستوں میں الور اور بھرت پور کے نام خاص طور پر لیے جاسکتے ہیں۔ ریاست کا قیام شاہ عالم ثانی کے عہد حکومت میں 1777ء میں عمل میں آیا۔ شاہ عالم ثانی نے مہاراجہ پرتاب سنگھ بانی ریاست کو شاہی علاقے میں سے کچھ زمین عطا کی تھی۔ کیونکہ مغلیہ سلطنت کی سرپرستی میں ریاست قائم ہوئی تھی اس لیے قیام کے زمانے سے ہی وہاں فارسی زبان کا استعمال شروع ہو چکا تھا۔ فارسی کی بدولت ریاست کے قیام کے بعد یہاں اردو شعر وادب کے فروغ کی راہیں ہموار کیں۔

والیانِ ریاست کے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ عہد وپیمان اور روابط کے باعث کمپنی کے دفاتر میں اردو کا استعمال شروع ہوا۔ نامور اربابِ علم وادب الور میں آکر سکونت پذیر ہوئے۔ اُن میں مولانا فضل حق خیر آبادی، مولانا نورالحسن کاندھلوی (سرسید کے استاد) جیسے علماء اور فضلاء بھی شامل تھے۔

ریاست کوٹہ:

شہنشاہ شاہ جہاں نے مادھو سنگھ کو اس کی خدمات کے صلے میں ریاست بندی کا کچھ علاقہ اور کچھ شاہی علاقہ عطا کرکے ریاست کوٹہ قائم کرائی۔ 1817ء تک والیانِ ریاست مغلیہ سلاطین سے شاہی مناصب واعزاز حاصل کرتے رہے مگر مغلیہ زوال کے باعث مہاراجہ امیر سنگھ نے انگریزوں سے معاہدہ کرکے مغلیہ سلطنت سے تعلقات ختم کردیئے۔ 1837ء میں ریاست کی اصلاح کی غرض سے انگریزوں کے ایماء پر ممتاز الدولہ نواب فیض علی خان، یہاں کے وزیر اعظم ہوئے تو سرکاری زبان اردو قرار پائی۔ چھاپہ خانہ قائم ہوئے۔ سرکاری قوانین اردو میں چھپنے لگے۔ چنانچہ وہاں کا "دستور العمل" عدالت دیوانی 1875ء میں مطبع فیض کوٹہ سے چھپ کر شائع ہوا۔ اس کے دو کالم ہیں ایک میں اردو رسم الخط ہے اور دوسرے میں دیوناگری۔ مگر زبان ان دونوں کی ایک ہی ہے جو خالص اردو ہے۔ 1775ء میں غالب کے شاگرد منشی گوبند سہائے نشاط یہاں جج مقرر ہوئے۔ ادبی فضا کا آغاز ان کی وجہ سے ہوا۔ 1880ء میں تفضل حسین ثابت کی بدولت اس فضا میں نکھار پیدا ہوا اور غیر مسلم اصحاب بھی شعر وسخن میں دلچسپی لینے لگے۔ کوٹہ میں اردو اپنے عروج پر پہنچنے سے پہلے بیسویں صدی کے شروع میں اس کی سرکاری حیثیت ختم ہونے سے زوال پذیر ہوگئی۔

لیکن 1947ء میں اردو سے اہل کوٹہ کی دلچسپی ختم ہوگئی اور صرف مکتا پرشاد غیر مسلم شعراء میں باقی رہ گئے۔ 1952ء میں ملازمت کی غرض سے راجستھان بننے کے باعث جو لوگ باہر سے یہاں پہنچے ان میں کچھ اہل سخن بھی تھے جن میں سے کچھ تبدیل ہوگئے اور کچھ موجود ہیں۔

ریاست اجمیر:

خطہ میواڑ کا اہم اور مرکزی مقام اجمیر ہے۔ اجمیر کی منفرد سیاسی سماجی اور ثقافتی تاریخ رہی ہے۔ 1818ء میں برطانوی راج نے اسے کمشنری کا درجہ دے کر اپنے اقتدار میں شامل کر لیا۔ یہاں بارہویں صدی عیسوی تک چوہان راجپوتوں کی حکومت تھی۔ 1151ء میں خواجہ معین الدین چشتی کی اجمیر میں تشریف آوری کے دور سے اِس علاقے میں فارسی زبان و ادب کے اثرات ظاہر ہونے لگے۔ خواجہ صاحب خود بھی مصنف، مفتی، عالم اور شاعر تھے۔ عرصہ دراز تک اجمیر میں فارسی شعر وادب فروغ پاتا رہا اور ساتھ ہی ساتھ بول چال میں اردو زبان اپنی ترویج کی منزلیں طے کرتی رہی۔ اس کا اثر لازمی طور پر مقامی زبان پر ہونا تھا لہٰذا خواجہ صاحب کی شان میں مقامی زبان میں کچھ ایسے اشعار ملتے ہیں جو اجمیر میں اردو کے نُفوذ کی نشاندہی کرتے ہیں۔

انگریزوں کے اقتدار قائم ہونے کے بعد 1818ء میں اجمیر میں شعر و سخن کی راہیں کھلی۔ 1844ء میں فخر شعراء میر نظام الدین ممنون کو انگریزوں کی جانب سے اجمیر کا صدر القدور مامور کیا گیا۔ اس زمانے میں اجمیر میں اردو شعر و سخن کو فروغ حاصل ہوا۔ 1873ء میں "دی سوشل ایسوسی ایشن" کے نام سے اجمیر میں ایک ثقافتی انجمن بھی قائم ہوئی جو معززین ہندو اور مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ مولوی عبدالحق نے اس انجمن کی رپورٹ بابت 1873ء کے اقتباسات بھی درج کیے ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے مقاصد میں اردو زبان کی ترقی و ترویج بھی شامل تھی۔

1874ء میں اجمیر سے ایک اخبار "اجمیر اخبار" کے نام سے اردو میں شائع ہونا شروع ہوا تھا جو سرکاری خبریں اور رپورٹیں شائع کرتا تھا۔(12) آہستہ آہستہ اردو نثر کی تصنیف وتالیف کی طرف توجہ بڑھتی چلی گئی۔

2۔ تہذیب و ثقافت کے ادب پر اثرات:

تہذیب کسی بھی معاشرے کے طرزِ حیات اور طرزِ فکر و احساسات کا جوہر ہوتی ہے۔ انسان کی نجی اور اجتماعی زندگی کے لئے تہذیب ایک فطری چیز ہے۔ تہذیب کے گہوارے میں انسانیت پروان چڑھتی ہے، ترقی کی راہیں کھلتی ہیں، انسانی تشخص قائم ہوتا ہے اور تہذیب یافتہ ہو کر انسان زندگی کے ہر موڑ پر کامیاب و کامران ہوتا ہے۔ زبان آلات، فنون لطیفہ، علم و ادب اور سماجی رشتے تہذیب کے مختلف مظاہر ہیں۔

"انگریزی زبان میں تہذیب کے لیے کلچر کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے
کلچر لاطینی زبان کا لفظ ہے اس کے لغوی معنی ہیں زراعت، شہد کی مکھیاں،
ریشم کے کیڑے، سیپیوں اور بیکٹیریا کی پرورش یا افزائش کرنا، جسمانی یا
ذہنی اصلاح و ترقی اور کھیتی باڑی کرنا۔" (13)

اردو، فارسی اور عربی کا لفظ تہذیب، انگریزی لفظ کلچر کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اِس کے لغوی معنی کسی درخت یا پودے کو کاٹنا، تراشنا، چھانٹنا تاکہ اس میں نئی کونپلیں پھوٹیں اور شاخیں نکلیں۔ تہذیب، شائستگی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں کلچر، تہذیب و تمدن کی اصطلاحوں کو گڈ مڈ کر دیا جاتا ہے۔

دانشوروں نے کلچر کو تہذیب و ثقافت کا اور بعض نے اسے تہذیب و تمدن کا مجموعہ سمجھا۔ تہذیب اور تمدن کے بیچ کی نوعیت کو مادی اور روحانی پہلوؤں کو جوڑ کر دیکھا گیا ہے۔ کلچر اور تہذیب کو ایک دوسرے کا مترادف قرار دینے کی روش تو بہت عام رہی ہے۔ وزیر آغا نے کلچر کو ثقافت، سیویلائزیشن کو تہذیب اور اربن کلچر کو تمدن کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اُن کی فکر انسانی مطالعے اور کلچر کے سائنسی نظریے سے پوری طرح مربوط ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے مختلف مضامین میں کلچر پر اظہار خیال کیا ہے۔ اُن کے خیال میں کوئی چیز ہوا میں معلق ہو کر پروان نہیں چڑھتی۔ کلچر کی بقا اس میں ہے کہ اس کے پاؤں زمین سے جڑے ہوں اور وہ اس سے غذا حاصل کرتا رہے۔ مختلف حالات و واقعات کے تحت ماحول میں تبدیلی قدرتی عمل ہے۔ اس لیے کلچر میں تغیّر و تبدّل بھی قدرتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے مطابق کلچر میں تبدیلی کی تین انواع خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

> اول: "کسی نئے مذہبی تجربے کا ظہور۔ دوم: کسی غالب قوم کا حملہ اور فتوحات اور دو گروپوں کی مخالفت اور معاشرتی اختلاط اور سوم: کسی بااثر اور غالب قوم کے تہذیبی اثرات کی یلغار"(14)

ٹائن بی کی رائے یہ ہے کہ سیاسی غلامی سب سے بڑی لعنت ہے کیونکہ سیاسی غلبے کے ہمراہ قوم کا کلچر بھی آتا ہے۔

تہذیب و ثقافت:

تہذیب (سیویلائزیشن)، ثقافت (کلچر)، کی اصطلاحیں عمرانیات، تاریخ اور فلسفے کے مباحث میں استعمال ہوتی ہیں البتہ ان کی تکنیکی تعریف میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے بعض دفعہ ان کو مترادف بھی سمجھ لیا جاتا ہے۔

سیویلائزیشن:

سیویلائزیشن کا لفظ Civic اور City سے متعلق ہے لٰہذا اس کے مفہوم میں مدنیت (شہروں کی اجتماعی زندگی) شامل ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے امریکہ کے بعض علماء کے حوالے سے کلچر اور سیویلائزیشن میں فرق ظاہر کر کے ان کے الگ الگ مفہوم بتائے ہیں۔ ان کے مطابق کلچر میں وہ مظاہر

شامل ہیں جن میں انسان نے فطرت کی تسخیر کی۔(تسخیر فطرت کے یہ مظاہر اب ٹیکنالوجی کی شکل میں موجود ہیں)۔اس کے برعکس سیویلائزیشن میں وہ مظاہر شامل ہیں جن میں تعلق انسان کا اپنے نفس پر غلبہ اور فطرت پانے سے ہے یعنی انسانی جبلتوں کو انسان نے جس طرح کنڑول کیا، جس طرح سنوارااوران کی تہذیب کی اوراس تہذیب سے جو رویے پیدا ہوئے ان کا نام سیویلائزیشن ہے۔

"شپنگلز، سیویلائزیشن سے مراد کسی اجتماع کا وہ درجہ کمال لیتا ہے جو اپنے عروج پر پہنچ کر آگے کے لیے جامد اور نا قابل ترقی و تخلیق ہو جاتا ہے۔ یعنی یہ وہ منزل ہے جس کے بعد انحطاط کا آغاز لازمی ہے۔" بیگ ہے کا خیال ہے کہ سیویلائزیشن کلچر کا نام ہے جو شہروں میں ظاہر ہوتا ہے۔ (یعنی تمدن)۔"(15)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ کلچر تو ایک عام طرزِ حیات سے عبارت ہے جو دیہات میں بھی ہو سکتا ہے اور شہروں میں بھی۔ لیکن جو کلچر شہروں میں فروغ پاتا ہے اسے سیویلائزیشن کہنا چاہیے۔(مدینہ: بڑے شہر، مدنیت: تمدن)اس شہری کلچر کی ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ اس سے متعلق افراد کو زراعت و فلاحت سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا کیونکہ یہ کام تو دیہات والے کرتے ہیں۔

کلچر کے لفظ کے اندر چونکہ تہذیب و تربیت کا مفہوم از خود شامل ہے لہٰذا اس سے اولین مراد انسانوں کی وہ انفرادی اور مجلسی خصوصیات ہیں جو کہ موروثی نہیں مثلاً ذوق، مخصوص آدابِ زندگی، مشاغل اور تفریحات وغیرہ۔ کلچر اجتماع سے بنتا ہے اور فرد معاشرے سے اِکتساب کرتا ہے۔ایک فرد خود "کلچر" ہو سکتا ہے مگر اس کے ذاتی کلچر کو اس گروپ کا کلچر نہیں کہا جا سکتا۔ گروپ کے کلچر سے فرد کا کلچر متعین ہوتا ہے۔ کلچر ایک محدود اصطلاح ہے۔ کلچر میں جب وسعت پیدا ہوتی ہے تو اس سے سیویلائزیشن پیدا ہوتی ہے۔ایک سیویلائزیشن کے اندر کئی ذیلی کلچر بھی ہو سکتے ہیں۔

کوئی کلچر سیویلائزیشن کے بغیر ہو سکتا ہے مگر ہر سیویلائزیشن کے لیے کلچر ضروری ہے۔ سیویلائزیشن کسی کلچر کی ترقی یافتہ اعلیٰ اور وسیع تر شکل ہے۔اس کا تعلق شہروں کے ظہور اور ان کی مخصوص زندگی (تمدن) سے ہے جہاں زندگی کے نئے اسالیب پیدا ہوتے ہیں جو دیہات کے کلچر کو متاثر کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ عقیدہ، فکر، عادات اور اخلاق و اطوار کے ساتھ ساتھ سیاسی، اجتماعی اور معاشرتی اداروں، حتیٰ کہ بین الاقوامی میدانوں میں بھی اپنے آثار چھوڑتا ہے، جس کے نتیجے کے طور پر مختلف علوم و فنون وجود پذیر ہوتے ہیں۔ آرٹ کی متنوع شکلیں ظہور میں آتی ہیں۔ فن تعمیر کے شاہکار تخلیق ہوتے ہیں۔ معاشی ادارے تشکیل پاتے ہیں اور سیاسی نظام بنتے ہیں۔اسی مجموعی تشخص کو تہذیب، حضارت اور سیویلائزیشن کا نام دیا جاتا ہے۔ عمرانیات کی اصطلاح میں ایک کو تشکیل اور دوسرے کو سماجی مظاہر کہا جاتا ہے۔ یہ دونوں باہم مربوط ہوتے ہیں اور ایک کا تصور دوسرے کے بغیر ناممکن ہے۔

تہذیب اور اس کے تشکیلی عناصر:

ول ڈیورنٹ نے معاشی سہولت، سیاسی تنظیم، اخلاقی روایات اور علمی استعداد کو تہذیب کے عناصر ترکیبی میں شامل کیا ہے اجزائے ترکیبی یا عناصر ترکیبی سے مراد وہ اجزاء ہیں جو بے حد بنیادی ہوں اور جن کے بغیر تہذیب یا ثقافت وجود میں نہ آسکتی ہو۔ اسی طرح سبطِ حسن کے نزدیک دنیا کی ہر تہذیب و ثقافت کی تشکیل چار بنیادی عناصر سے وجود میں آتی ہے۔

1۔ طبعی حالات

2۔ آلات و اوزار

3۔ نظام فکر و احساس

4۔ سماجی اقدار

تہذیب و ثقافت کی پیدائش اور نبود کے لیے کوئی طے شدہ تاریخی یا عمرانی اصول و ضوابط نہیں ہوتے۔ یہ کسی بھی براعظم رنگ و نسل میں پیدا ہو سکتی ہے۔ کوئی بڑی نسل تہذیب کو پیدا نہیں کرتی بلکہ بڑی تہذیب ہی ہوتی ہے جو قوموں کو تخلیق کرتی ہے۔ تہذیب کوئی جامد شے نہیں ہے نہ ہی لازوال ہے۔ یہ بنتی اور بڑھتی رہتی ہے تہذیب ثقافت کی اعلیٰ شکل ہوتی ہے۔

تہذیب کسی قوم یا معاشرے کی مشترکہ خصوصیت ہوتی ہے جس سے نہ صرف وہ قوم یا معاشرہ پہچانا جاتا ہے بلکہ دوسری اقوام سے فرق کرنا چاہیں تو تہذیب و ثقافت کی مدد سے ہی اس کا تعین کیا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جبلت کی بنا پر قوموں کے درمیان امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر بھوک لگتی ہے ہم کھانا کھا لیتے ہیں، پیاس لگتی ہے ہم پانی پی لیتے ہیں، سردی لگتی ہے ہم کمبل اوڑھ لیتے ہیں اور ہر ممکن طریقے سے خود کو سردی سے بچانے کی سعی کرتے ہیں۔ یہ ایک جبلی عمل ہے اور دنیا کی ہر قوم میں پایا جاتا ہے۔ اسے تہذیب یا کلچر کے ذیل میں نہیں لایا جا سکتا البتہ کھانا پکانے اور کھانا کھانے کے طریقے کلچر کا حصہ ہیں۔ انھی طریقوں سے قوموں کے درمیان امتیاز کیا جاتا ہے۔ تہذیب کی ساخت، پرداخت، انسان کی ہی رہین منت ہے۔ تہذیب خلاء میں جنم نہیں لیتی۔ کچھ تہذیبی رویے وراثت میں ملتے ہیں۔ اصل تہذیب ماحول، خاص عقائد و افکار اور دوسرے اثرات کے تحت پنپتی ہے۔ کوئی بھی تہذیب دوسری تہذیبوں سے الگ ہو کر پروان نہیں چڑھ سکتی۔ ماضی کی تہذیبیں، ان کے تجربات، ہم عصر تہذیبیں، کسی بھی تہذیب پر مختلف انداز میں اثر انداز ہوتی ہیں۔ تہذیب پر نہ صرف قومی رجحانات اور میلانات کا اثر ہوتا ہے بلکہ دوسری تہذیبیں بھی اسے متاثر کرتی ہیں۔ یہ اثر پذیری اور لچک تہذیبوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ دوسری تہذیبوں کے خواص قبول کرنے کی صلاحیت ہی کسی تہذیب کو محرک اور زندہ و تابندہ رکھتی ہے۔ کبھی بھی تہذیب کٹ کر محدود ہو کر آگے کی طرف قدم نہیں بڑھا سکتی۔ خیالات اور تصورات کے تصادم سے ہی ثقافت پروان چڑھتی ہے۔

کچھ پرانی تہذیبیں جب مٹتی ہیں تو وہ اپنے تجربات، وسائل، نظریات نئی تہذیب کو منتقل کر جاتی ہیں اوپر بیان کئے گئے بنیادی عناصر تمام تہذیبوں میں پائے جاتے ہیں تو یہ عین ممکن ہے کہ مختلف تہذیبوں میں ان عناصر کی ہئیت مختلف ہو یا ایک عنصر دوسرے عنصر سے نمایاں ہو لیکن یہ کسی طور ممکن نہیں کہ کسی تہذیب میں سرے سے عناصرِ ترکیبی میں سے کوئی عنصر موجود ہی نہ ہو۔

زندگی گزارنے کے طریقے، رسوم ورواج، موسم، تہوار، زبان کامیابی یا ردوبلا کے اقدامات ارد گرد کے ماحول سے اثرات قبول کرنا اور اسی قسم کی دوسری لاتعداد صفات تہذیب کے اہم اجزاء میں شمار ہوتی ہیں۔ان کی مثال ایک درخت کی سی ہے جس سے انسانی معاشرہ توانائی کشید کر کے پروان چڑھتا ہے۔ جس تہذیب میں یہ اجزاء موجود ہوں وہ کچھ عرصے کے لیے ثقافتی اعتبار سے فعال ہو جاتی ہے اور اس کے فنون لطیفہ اور ادب میں معاشرے کی روح سمٹ آتی ہے جسے اس معاشرے کی تہذیب کا بہترین ثمر قرار دیا جاسکتا ہے۔ تہذیب کے اثرات میں ایک تہذیبوں کا فرق بھی ہے۔ پاکستان کی ثقافت عرب کی ثقافت سے مختلف ہو سکتی ہیں لیکن دونوں کی تہذیب مشترکہ ہوگی۔ جو ان کو مغربی ممالک سے الگ کرے گی۔ بلوچستان کے کسی گاؤں کی ثقافت، پنجاب کے کسی گاؤں سے مختلف ہوگی۔ایسے ہی راجستھان کے کسی گاؤں کی ثقافت یوپی کے کسی گاؤں سے الگ ہو سکتی ہے لیکن دونوں کی مشترکہ ثقافت اسلامی ہوگی جو انگلستان کے کسی گاؤں سے مختلف ہوگی۔ پاکستان کا رہنے والا مختلف سطحوں پر خود کو پاکستانی بتا سکتا ہے، سندھی بھی، بلوچی بھی، پنجابی بھی اور مسلم بھی۔ آخری سطح وسیع ترین ہے جس سے کوئی بھی فرد وابستہ ہوتا ہے۔

تہذیب اور ادب:

کسی بھی تہذیب کا تعلق کسی خاص نسل انسانی سے نہیں ہوتا، بلکہ وہ تمام دنیا اور دنیا کی تمام نسلوں پر مشتمل ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ تاریخ دنیا میں ظہور پذیر ہونے والی ہر قوم، تہذیب و تمدن کے باب میں

کچھ نہ کچھ صفحات رقم کرتی ہے۔ بعض تہذیبیں اپنی ٹھوس بنیادوں، زبردست اثر اور افادہ عام کی بدولت دیگر تہذیبوں سے ممتاز ہو جاتی ہیں۔ ہر وہ تہذیب جس کا پیغام عالمگیر ہو، جس کی ہدایات اخلاقی قدروں کی پاسدار ہوں اور جس کے اصول و ضوابط، حقیقت پسندی پر مبنی ہوں، تاریخ میں بقائے دوام حاصل کرتی ہے اور ہر زمانے میں اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ کوئی بھی تہذیب کلچر یا ثقافت کی صورت پذیر نہیں ہوتی بلکہ وہ تو ایک طویل سلسلے کی آخری شکل ہوتی ہے۔ موجودہ نسل کے ثقافتی رجحانات وہی ہوں گے جو ان کے بزرگوار نسل نے ان میں پیدا کیے ہوں گے۔ موجودہ نسل پرانی نسل کی جانشین ہوتی ہے۔

ثقافت کی صورت میں دونوں نسلوں میں قدرتی رابطہ موجود ہوتا ہے یہی قدرتی رابطہ ہر آنے والے وقت میں اس علاقے کے علم و ادب پر اثر انداز ہوتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی ادب کے بڑے بڑے دور وجود میں آئے ہیں تو سماجی قوتوں اور تہذیبی عوامل کے ساتھ ساتھ ادب پڑھنے اور اس میں گہری دلچسپی لینے والے قارئین ہمیشہ شریک رہے ہیں۔ اگر لکھنے والے کو یہ احساس ہو جائے کہ اس کی تحریر کو پڑھنے والے۔ پرکھنے والے۔ جانچنے والے موجود ہیں۔ نہیں تو لکھنے کا عمل کمزور ہو کر رہ جائے، تخلیقی توانائی کمزور پڑ جائے تو تحریر میں اثر آفرینی پیدا نہیں ہوتی جس سے پڑھنے والے کا ذہن لکھنے والے کی گرفت میں آجاتا ہے۔ بڑا قلم کار پڑھنے والوں کی خود بخود ایک جماعت پیدا کرتا ہے، انہیں متاثر کرتا ہے اور ان کے ذہنوں کو اپنے افکار سے بدل کر رکھ دیتا ہے۔ یہاں ممکن ہے کہ آپ سوچیں کہ آخر ادب کی ضرورت ہی کیا ہے۔

غور کیجئے بھلا اب اتنا زمانہ گزرنے کے باوجود سعدی، حالی، غالب، اقبال، حافظ یا مولانا روم آج بھی ہمیں کیوں متاثر کرتے ہیں کہ وقت کے ساتھ زندگی کے انداز اور فکر و نظر کے سانچے اب وہ نہیں رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ادب زندگی کے چھوٹے بڑے تجربات اور سچائیوں کو ایسے خوبصورت اور رس دار پیرائے میں بیان کرتا ہے کہ یہ سچائیاں الفاظ کا پیراہن اوڑھ کر ہمیشہ کے لیے دلوں میں محفوظ ہو

جاتی ہیں۔ادبی اظہار گزرے حالات واقعات کا جامعہ اور پہلو دار اظہار ہوتا ہے جس کے مختلف پہلو زندگی کو بدل کر رکھ دیتے ہیں۔

ادب کے ذریعے ہم دوسروں کے تجربات میں شراکت دار بن جاتے ہیں۔ادب کے ذریعے ہی انسان بلوغت کے درجے تک پہنچتا ہے۔ذرا سوچئے اگر اقبال، سعدی، گوئٹے نہ ہوتے اور ان کے تجربات انسانی فکر اور احساسات کا حصہ نہ بنتے تو انسان آخرت سے بے بہرہ ہوتا۔مرد زندگی گزارتے ہوئے بہت سے جذبات سے آشنا ہوتا ہے کچھ پختہ اور خام تجربات سے گزرتا ہے لیکن محسوس کرنے کے باوجود راحت سے بیان نہیں کر پاتا۔لیکن کوئی ناول، افسانہ، شعر، ڈرامہ کو پڑھتے ہوئے جب انہی احساسات سے ہمارا پالا پڑتا ہے تو ہمیں ادراک ہوتا ہے کہ ہم اس بے نام سی کیفیت سے گزر چکے ہیں۔جو دوسروں کے تجربات ہمارے شعور کا حصہ بن جاتے ہیں اور اس طرح اب اپنی زندگی میں نئے معنی، فکر کی نئی بستی اور احساس کی نئی گہرائیاں تلاش کر لیتے ہیں۔اگر ہم اپنی زندگی کو معاشرے سے کاٹ کر صرف اپنے تجربات تک محدود کر لیں گے تو ہماری زندگی ایک اندھیری غار بن کر رہ جائے گی۔بلکہ عین ممکن ہے کہ ہمارے ذاتی تجربات کوئی خطرناک صورت اختیار کر لیں۔ادب کے ذریعے دوسروں کے تجربات میں شامل ہو کر ایک طرف پڑھنے والے کا کتھارسس ہو جاتا ہے اور دوسری طرف اس کی زندگی میں اعتدال اور توازن پیدا ہو جاتا ہے۔

ادب شعور بخشتا ہے جس سے گزر کر فرد اور معاشرہ تجربے کے گہرے سمندروں میں ڈوب کر زندگی کا سراغ پانے لگتے ہیں۔ادب، زندگی، تہذیب اور قاری لازم و ملزوم ہیں۔تہذیب کسی حد تک ادب پر اثر انداز ہوتی ہے۔اس کا اندازہ ہم ہندوستانی تہذیب پر ترکی اور ایرانی تہذیب کے اثرات سے لگا سکتے ہیں۔سلطان محمود غزنوی دولت کی ہوس میں ہندوستان آیا تھا۔اسے کیا خبر تھی کہ غزنوی فوج کے حملہ آور ایک ایسی تہذیبی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوں گے جس کے نقوش صدیوں تک مٹائے نہ جا

سکیں گے۔اس تہذیبی انقلاب کی داغ بیل ترکوں نے ڈالی تھی البتہ اس طرزِ معاشرت پر ایرانی تہذیب کی گہری چھاپ تھی۔ دراصل اس زمانے میں بغداد سے بخارا تک ایرانی تہذیب کا ہی دور دورہ تھا تہذیب کا غلبہ ہندوستانی تہذیب پر قریب قریب 800 سال تک رہا۔

اس غلبے کی سب سے روشن مثال فارسی ہے۔انیسویں صدی تک حکومتی اداروں سرکاری دفاتر کا سارا کام اسی زبان میں ہوتا تھا علاوہ ازیں ذریعہ تعلیم بھی فارسی تھا۔ شاہی دربار تک رسائی اور سرکاری ملازمت کے لیے بھی فارسی سے آشنائی ضروری تھی۔ شادی بیاہ، زمین کے تبادلے، شاعری اور فکر و فن کا اظہار بھی فارسی زبان میں ہی کیا جاتا تھا۔ فارسی زبان تہذیب اور شائستگی کی علامت قرار دی جاتی تھی۔ اس زمانے میں جس کو فارسی نہیں آتی تھی اسے گنوار سمجھا جاتا تھا۔

اٹھارویں صدی میں ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں غیر مسلم خود مختار ریاستیں قائم ہو گئی تھیں لیکن ان کی بھی دفتری زبان اور علم وادب کی زبان زیادہ تر فارسی ہی تھی۔ ہندوستانی تہذیب پر ایرانی تہذیب کے غلبے کے سبب اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ترکوں کا رہن سہن یہاں کے باشندوں سے مختلف تھا۔ان کی متعدد ضروریات زندگی یہاں نہیں ملتی تھی۔ان ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے متعدد صنعتوں نے فروغ پایا۔ حکام وقت کے اطوار اور رسوم ورواج اپنانے کے لئے نئے پیشے اختیار کئے جانے لگے۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ ہندوستان کے سوچنے اور محسوس کرنے کے انداز، پوشاک، علم و حکمت، موسیقی، مصوری، تعمیرات، آرائش و زیبائش کے سامان، جراحی، آلاتِ طبّی، حرب، آلات کاشت کاری، نشست و برخاست اور ادب پر ایرانی تہذیب کا رنگ چڑھ گیا۔ ایرانی غلبے سے ہندوستانی تہذیب دو الگ خانوں میں بٹ گئی۔ایک خانہ ایرانی تہذیب کا اور دوسرا مقامی تہذیب پر مشتمل تھا۔ایرانی تہذیب کو راج سنگھاسن نصیب ہوا لیکن مقامی تہذیب غربت کا شکار تھی۔ مقامی تہذیبیں بنا کسی سرپرستی

کے اپنی داخلی صلاحیتوں کے طفیل زندہ رہیں ورنہ ہر مہاراجہ یا نواب نے ان کی سرپرستی سے گریز کیا اور ان کی ترقی و ترویج کے لیے دلچسپی نہیں لی۔

روابط و سلوک، اخلاق و آداب، رسوم و رواج، طرزِ حیات، حسن و جمال اور اظہارِ فن کے جو طریقے رائج ہوتے ہیں وہی اس معاشرے کی سماجی اقدار ہوتی ہیں۔ یہ اقدار کسی کمیٹی میں نہیں بنائی جاتیں اور نہ ہی کسی قانون کے تحت وجود میں آتی ہیں بلکہ وقت کے ساتھ معاشرے کی جدوجہد سے بنتی ہے۔ ان کے پیچھے صدیوں کا تجربہ، مشاہدہ اور روایات ہوتی ہیں۔ سماجی قدریں رفتہ رفتہ تشکیل پاتی ہیں اور معاشرے کے افراد حتی المقدور ان کی پابندیاں کرتے ہیں۔ معاشرہ اپنی سماجی قدروں کی پاسبانی اس وجہ سے کرتا ہے کہ سماج کی بقا کا انحصار انہی اقتدار کی بقا پر ہوتا ہے۔ اگر ان سے پہلو تہی کی جائے تو معاشرتی شیرازہ بندی منتشر ہو کر رہ جائے۔

بعض سماجی اقدار اپنے عہد کی قریب قریب سبھی تہذیبوں میں مشترک ہوتی ہیں مثال کے طور پر راست بازی، عدل و انصاف، رحمدلی، مظلوم کے ساتھ ہمدردی، بزرگوں کا احترام، شادی بیاہ کی تقاریب میں خوشی اور اموات پر غم کا اظہار، رقص و موسیقی اور شاعری جیسی اقدار تقریباً ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔ معاشرتی ماحول اور سماجی حالات میں جو تبدیلیاں آئی ہیں ان کا اثر قدروں پر بھی پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی زمانے میں عرب قوم مروت کو انسانیت کا جوہر سمجھتی تھی جبکہ اب بغداد، دمشق، قاہرہ، جدہ اور بیروت وغیرہ جو عرب تہذیب کے مراکز ہیں وہاں احساس و مروت کا شائبہ تک نہیں ملے گا۔ سماجی اقدار کی یہی تبدیلی آگے چل کر ادب پر بھی اثرانداز ہوتی ہے۔

وادیِ سندھ کی تہذیب کے گم گشتہ نقوش کھنگالنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ تحریر کے فن سے بخوبی آگاہ تھے مگر شاید درختوں کی چھال یا پتوں پر لکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عراق اور مصر کے برعکس یہاں ایک بھی نوشتہ نہیں ملا ہے۔ البتہ مٹی کی مہروں پر کھدے ہوئے تصویری الفاظ ضرور دستیاب

ہوئے ہیں۔ ان کی تعداد دو ہزار کے لگ بھگ ہے اور ان پر تقریباً تین سو علامتیں کندہ ہیں۔ ایک تہائی علامتیں ایسی ہیں جن کی تکرار دس بار ہوتی ہے۔ دو درجن علامتوں کی سو بار البتہ ایک علامت ایسی ہے جس کی تکرار آٹھ سو بار ہوتی ہے۔ یہ تاجر حضرات کی ذاتی مہریں تھیں جن سے ان کے مال اسباب کی پہچان ہوتی تھی۔

ان مہروں پر بیل، ہاتھی، گینڈا، ہرن، مچھلی، جہاز، تیر، کمان، کپاس کے پھول، کنگھی، پہیہ یا پہاڑ وغیرہ کی علامتیں بنی ہوئی تھیں۔ اُن کی بعض رسموں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ ان رسموں کا تعلق فصلوں کی افزائش سے تھا۔ آثار قدیمہ کی ان شہادتوں سے وادی سندھ کی تہذیب کا جو نقشہ ابھر کر سامنے آتا ہے وہ ایک نہایت امن پسند مگر کاروباری معاشرے کا ہے۔ یہاں اُوزان کے پیمانوں کا بھی رواج تھا۔ محمد بن قاسم کی آمد سے تہذیب میں عربی اثر ونفوذ ہوا۔ برصغیر پاک وہند میں قرآن پاک کا پہلا ترجمہ سندھی زبان میں ہوا۔(16)

راجستھان میں ایسی تعلیمات کے پھیلنے کے متعلق سبطِ حسن اپنی کتاب "پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء" میں لکھتے ہیں:

> "الور کے ہندو راجا مہروک بن رائک نے منصورہ کے حاکم عبداللہ بن عمر ہباری سے درخواست کی کہ اسلامی تعلیمات کو سندھی زبان میں منتقل کیا جائے تو بہت اچھا ہوگا۔ عبداللہ نے ایک عراقی کو جس کی پرورش منصورہ میں ہوئی تھی الور روانہ کیا۔ وہ سندھی اور عربی دونوں زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔ یہ عراقی تین سال رہا وہاں اس نے قرآن شریف کا ترجمہ راجہ کی فرمائش پر سندھی زبان میں کیا اور راجہ کی تعریف میں ایک قصیدہ بھی سندھی زبان میں لکھا۔"(17)

تین سو سال کی طویل مدت میں اہل سندھ نے عربوں سے اور عربوں نے سندھیوں سے بہت کچھ سیکھا۔ عربی الفاظ کی وجہ سے سندھی لغت کا ذخیرہ بہت وسیع ہو گیا۔ سندھ کی تہذیبی تشکیل میں ہندو ذہنوں پر اسلامی تعلیمات کا اثر پڑنا قدرتی بات تھی۔ یہ اثرانگیزی تحریک کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ تصوف اور بھگتی کے قریب قریب دونوں میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ ترکوں اور افغانوں نے برصغیر میں تقریباً ساڑھے پانچ سو سال (1010ء تا1552ء) تک حکومت کی۔ ان کے عہد میں ملک کے نظامِ معیشت و معاشرت اور طرزِ فکر واحساس میں بعض اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں اور علوم وفنون میں بڑی ترقی کی۔ اس تہذیب کا نقطہ عروج گو اکبر اعظم کے سر ہے لیکن اسے بام عروج تک پہنچانے میں عالموں، صوفیوں، ادیبوں اور فنکاروں کا ہاتھ ہے۔

اس حوالے سے سبطِ حسن کہتے ہیں:

"راجپوتانہ میں مصوری کا رواج موجود تھا۔ راجستھانی مصوری کے مرکزوں میں بندیل کھنڈ، جودھپور، اودے پور، بیکانیر، جے پور اور مالوہ زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ یہاں کے راجاؤں نے مصوری کی بڑی قدر دانی کی۔"(18)

مندرجہ بالا تہذیب پر کی گئی تمام بحث کو سمیٹتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انسان نے تمدن کی بنیادیں اور شکلیں تخلیق کیں۔ معاشرتی زندگی کے تمام طریقے ایجاد کیے۔ شکار، ماہی گیری، گلہ بانی، کاشتکاری، نقل و حمل، تحریر و تقریر، تعمیر وترقی، صنعت و تجارت، مالیت اور سیاسی زندگی کا ڈھانچہ منظم کیا۔ جرگہ، خاندان دیہی کمیونٹی، جنس کی باضابطگی، اخلاق و عادات اور وفاداری کی اقدار میں توقیر اور عمدگی پیدا کی۔ سائنس، ادب اور آرٹ کو شروع کیا۔ ٹیکنالوجی کو ترقی دینے کی کوشش کی گئی۔ جانور سے عاقل کی طرف سفر شروع کیا۔ انتشار سے ہئیت وجود میں آئی۔ پس معلوم ہوا کہ تہذیب خالص انسانی

تخلیق ہے اور انسان ہی اس کا واحد ضامن ہے۔ لیکن انسان تہذیب کے جراثیم ماں کے پیٹ سے لے کر نہیں آتا وہ بات چیت کرنا، آلات واوزار کو استعمال کرنا، سماجی، روحانی اور جسمانی فرائض ادا کرنا معاشرے سے ہی سیکھتا ہے۔ یہ تہذیب ایک نسل سے دوسری نسل کو جسمانی یا جبلی طور پر منتقل نہیں کی جا سکتی۔ اس کے لیے اس دور کے علوم و فنون اور ادب کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی بھی تہذیب کے پنپنے میں یا ترقی یافتہ ہونے میں ادب اہم کردار ادا کرتا ہے اور تہذیب پر بلاشبہ ادب اپنے اثرات مرتب کرتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ وارث سرہندی، "قاموس مترادفات"، مؤلفہ: اردو سائنس بورڈ، لاہور

2۔ سبطِ حسن، "پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء" مکتبہ دانیال، لاہور، 1996ء، ص:13

3۔ ول ڈیورنٹ، "ہندوستان (مترجم: طیب رشید)"، تخلیقات، لاہور، 1986ء، ص:9

4۔ قرآن مجید، سورت الحجرات، آیت:13

5۔ ناہید قمر، ڈاکٹر، "اردو ادب میں تاریخیت"، پورب اکیڈمی، اسلام آباد، 2017ء، ص:3

6۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، "آرٹ اور کلچر"، رائل بک کمپنی، کراچی، 1996ء، ص:16

7۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، "عمل"، مجلس ترقی ادب، لاہور، 2010ء، ص:55

8۔ نجم الغنی، مولوی، "وقائع راجستھان (مرتبہ)"، ہمدم پریس، دہلی، 1960ء، ص:10

9۔ عبدالحق، مولوی، "جائزہ زبانِ اردو (مرتب)" انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی، مطبوعہ 1960ء، ص:
10

10- عبدالحق، مولوی، "ریاست جے پور اور اردو زبان"، جیّد پریس، دہلی، 1944، ص:3

11- منشی جوالہ سہائے ماتھر، "وقائع راجپوتانہ (جلد دوم)"، مفید عام پریس، آگرہ، 1979ء، ص:434

12- محولہ بالا، ص:43

13- سبطِ حسن، "پاکستان میں تہذیب کا ارتقا"، مکتبہ دانیال، لاہور، 1996ء، ص:13

14- سید عبداللہ، ڈاکٹر، "کلچر کا مسئلہ"، شیخ غلام علی پبلشرز، کراچی، اشاعت اوّل، 1977ء، ص:16

15- ایضاً، ص:19

16- سبطِ حسن، "پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء"، مکتبہ دانیال، لاہور، 1996ء، ص:160

17- ایضاً، ص:168

18- ایضاً، ص:353

باب سوم

ناول ''اندھیرا پگ''کا تہذیبی و ثقافتی تناظر میں جائزہ

ناول میں تہذیب و ثقافت سمونے کی ابتداء نذیر احمد دہلوی سے ہی شروع ہو گئی تھی۔ ناول نذیر احمد دہلوی، رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شررؔ سے ہوتا ہوا جب مرزا ہادی رسوا تک پہنچا تو یہ بلوغت سے ہمکنار ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ "امراؤ جان ادا" (1899ء) کو لکھنو کی زوال آمادہ معاشرت کی بھرپور عکاسی اور خوبصورت فنی برتاؤ کے باعث کلاسیک کا درجہ حاصل ہوا۔ پورا ناول ایک طوائف کے گرد گھومتا ہے لیکن وہ طوائف اصل موضوع نہیں بلکہ ہندوستان کی مٹتی ہوئی لکھنوی معاشرت کی عکاسی اسی ناول کے ذریعے کی گئی ہے۔ اسی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے حقیقت نگاری کی اگلی کڑی پریم چند (1880ء تا 1936ء) ہیں۔ جنہوں نے ہندوستانی دیہی اور شہری معاشرت کی تصویریں اپنے فن پاروں میں پیش کیں۔ جس طرح نذیر احمد کے ناولوں میں مسلم معاشرت جھلکتی ہے اسی طرح پریم چند کا طرزِ احساس ایک ہندوستانی کا ہے۔ ان کے ناولوں میں پہلی بار ہندوانہ کردار اور معاشرت واضح نظر آتی ہے۔ پریم چند کے بعد اردو فکشن میں کئی نئے رجحانات اور موضوعات متعارف ہوئے۔

سجاد حیدر یلدرم کی روحانیت سے لیکر مارکس کی ترقی پسندی اور فرائڈ کی نفسیات تک کو تخلیقی ہیئت میں ڈھالا گیا۔ اس دور میں تکنیک اور اسلوب کا تنوع پیدا ہوا۔ عزیز احمد کے ناولوں میں مغربی معاشرے کی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے "گریز" کے ہیرو نعیم کا نفسی بحران دراصل روحانی اور اخلاقی قدروں سے محروم ہوتے کلچر کا بحران ہے۔ عزیز احمد کے ناولوں نے فکشن نگاری کو اعتبار بخشا ہے۔ عزیز احمد کے ایک اور ناول "ایسی بلندی ایسی پستی" میں سلطان حسین اور نور جہاں کے ازدواجی رشتے کی

وساطت سے حیدر آباد دکن کی زوال خوردہ تہذیبی و ثقافتی زندگی کی پرتیں بے رحمی سے اتاری گئی ہیں۔ حیدر آباد جو کبھی تہذیبی مرکز ہوا کرتا تھا اس کی جنس زدہ طبقہ امراء کی خانگی اور سماجی زندگی کی تصویروں سے منافقت زدہ معاشرے کی شکست وریخت کے عوامل اجاگر کیے گئے ہیں۔

محمد حسن عسکری عزیز احمد کے حوالے سے کہتے ہیں:

"یہی بات معلوم کرنے کا انہیں بہت شوق ہے کہ کوئی تہذیب یا قوم یا نسل یا ادارہ زمانے کے ساتھ کس طرح بدلتا چلا گیا ہے۔اور اس نے کیا کیا شکلیں اختیار کی ہیں"(1)

ڈاکٹر احسن فاروقی کا ناول "شام اودھ"(1948ء) جب منظر عام پر آیا تو بٹوارا ہو چکا تھا۔ لیکن یہ ناول سیاسی اثرات سے آزاد نظر آتا ہے البتہ ان کا ناول "سنگم"(1960ء) تقسیم کے سیاسی و تہذیبی مناظرات سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ اس ناول میں لکھنو کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی جھلکتی ہے۔ ان کے کردار نواب ذوالفقار کی موت ایک تہذیب کی موت ہے۔ پاکستانی ناول تہذیبی و ثقافتی تناظرات میں روشن ماضی میں تہذیبی زوال کے محرکات کی تلاش کرتا نظر آتا ہے۔

اس عرصے میں، اردو ناول سماجی حقیقت نگاری اور فطری حقیقت نگاری کی منزلوں سے گزرا۔ برصغیر کی سیاسی تقسیم ایک بہت بڑا واقعہ تھی جس نے ہندو مسلم تہذیبی تقسیم کو عملی حقیقت دے دی۔ جس کے نتیجے میں ہجرت اور فسادات جیسے المناک واقعات رونما ہوئے۔

ناول میں ماضی کے تہذیبی ادوار کی تباہی، تقسیم سے وابستہ عوامل و توقعات، مادیت پرستی کے اثرات اور نتائج کو اپنے دامن میں سمیٹا۔ اردو ناول میں ارضیت پسندی، ماضی پرستی، ہندو مسلم کلچر سے وابستگی، مشرقی اقدار کی گمشدگی جیسے موضوعات کو جگہ دی گئی۔ ان رجحانات سے کسی نہ کسی صورت تہذیبی بازیافت کی آرزو جھلکتی ہے۔

1949ء میں قرۃ العین کا پہلا ناول "میرے بھی صنم خانے" شائع ہوا۔ اس ناول کی فضا یوپی کے امیر طبقہ کی زندگیوں سے متعلق ہے۔ جسے قرۃ العین نے قریب سے دیکھا تھا۔ نقاد شمیم احمد نے خوب لکھا ہے کہ:

> "میرے بھی صنم خانے" اور کسی حد تک "سفینۂ غمِ دل" اس ہندوستان کا نوحہ ہے جو صدیوں سے مختلف قوموں کے خون سے سینچا گیا تھا۔ جس کی گنگا جمنی تہذیب نے صدیوں مہذب دنیا کو اپنی طرف متوجہ رکھا"(2)

یہ دونوں ناول ایک خاص تہذیبی و سماجی پس منظر رکھنے والے طبقہ امراء سے تعلق رکھتے ہیں۔ خدیجہ مستور کے ناول "آنگن" (1962ء) کی بنیادی خاصیت یہ ہے کہ برصغیر میں سیاسی جدوجہد کرنے والے کارکنوں اور ان کے وابستگان پر کیا بیتی؟ مسلم لیگی سیاست پر لکھنے کے باوجود خدیجہ مستور نے اپنے آپ کو غیر جانبدار رکھا ہے۔

پاکستان میں تہذیبی و ثقافتی قدروں کے بحران کی حقیقت پسندانہ عکاسی، مغربی کلچر کے بڑھتے ہوئے اثرات کے مدافعتی ردعمل اور اخلاقی زوال کے حوالے سے شوکت صدیقی کا "خدا کی بستی" (1957ء)، رضیہ فصیح احمد کا "آبلہ پا" (1965ء)، رشیدہ رضوی کا "اسی شمع کے آخری پروانے" (1970ء) قابلِ ذکر ناول ہیں۔ حیات اللہ انصاری کا ضخیم ناول "لہو کے پھول" (1964ء) تہذیبی تضادات کو ہندو مسلم کی رو سے سامنے ابھارتا ہے۔

نثار عزیز بٹ کے دو ناول "نے چراغ نے گلے" (1973ء) اور "کاروانِ وجود" بھی پاکستانی سیاسی و تہذیبی افکار و نظریات کو پیش کرتے ہیں۔ عبداللہ حسین کا ناول "اداس نسلیں" (1963ء) کو اردو ناول کی روایت میں خاصی اہمیت حاصل ہے۔ جس میں 1913ء سے لے کر 1947ء تک کے

واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ تقسیم ہند سے قرۃ العین حیدر سے لے کر انتظار حسین تک بے نیاز نظر آتے ہیں۔ جمیلہ ہاشمی کے پہلے ناول "تلاشِ بہاراں" (1961ء) کے تمام کردار ہندو ہیں۔ اسی وجہ سے ناول کی فضا اور ماحول پر ہندو آریائی تہذیب اور دیو مالا کا طلسم چھایا ہوا ہے۔ اس ناول کی حد تک جمیلہ ہاشمی روحانیت پسند، اور پر کشش ہندو مسلم مشترکہ کلچر کی اسیر دکھائی دیتی ہیں۔ بقول ڈاکٹر جمیل احمد جالبی:

"ہم اپنے حال کو ماضی کی روشنی سے منور کر سکتے ہیں۔" (3)

اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے جمیلہ ہاشمی کا تخلیقی شعور ہندوستان کی دھرتی سے نمو پانے والی ہند آریائی اور ہندو مسلم تہذیب کے مظاہر کام میں لانے کے بعد سر زمین حجاز کی طرف متوجہ ہوا۔ جمیلہ ہاشمی کے تاریخی ناول "دشت سوس" نے پڑھنے والوں کو تاریخیت، حقیقت پسندی اور ادبی ترفع سے آشنا کیا۔ جیلانی کامران کہتے ہیں:

"تاریخی ناول ہمارے زمانے تک پہنچتے ہوئے ایک نئے مزاج سے آشنا
ہوا ہے اور ایسی تاریخی آشنائی، تاریخی ناول کو جمیلہ ہاشمی نے مہیا کی ہے۔
(4)"

تصوف کی روایت اور نفسیاتی اور روحانی بحران کو بانو قدسیہ نے "راجہ گدھ" میں منفرد انداز میں پیش کیا۔ موجودہ انسانی صورتحال کے تناظر میں راجہ گدھ کو ایسی فکری بازیافت کہا جا سکتا ہے جس کی وساطت سے عالمگیر سطح پر صحت مند کلچر تشکیل دیا جا سکتا ہے۔ "راجہ گدھ" کو اس کے موضوع کی انفرادیت، کرداروں کے معنی آفرین نفسیاتی پیشکش اور اسلوب کی دلکشی کے باعث کامیاب فکری ناول سمجھا گیا۔ "راجہ گدھ" کے بارے میں ڈاکٹر ممتاز احمد خان کی رائے کلیدی حیثیت کی حامل ہے کہ:

"یہ ناول ہماری اپنی دھرتی کا وہ ناول ٹھہرتا ہے جس میں ہم زمینی جڑیں
تلاش کرنے کے بجائے اپنی روحانی جڑیں تلاش کرتے ہیں اور اسی سے
ہم آہنگ ہونے کی جستجو رکھتے ہیں"(5)

اردو ناول میں تہذیبی اور ثقافتی بازیافت کا عمل اس ناسٹلجیائی طرز احساس میں بھی ظاہر ہوتا ہے جسے انتظار حسین نے رجحان کی شکل دی۔ اس رجحان کا تعلق تقسیم ہند اور فسادات و ہجرت کے واقعات سے ہے جسے انتظار حسین نے "بستی"، "تذکرہ" اور کسی حد تک "آگے سمندر ہے" میں برتا ہے۔ "بستی" میں تاریخ کے پروفیسر ذاکر اور اس کے خاندان کو ارضی رشتوں کے حوالے سے ماضی کی محبت کا اسیر دکھایا گیا ہے۔ ذاکر اب لاہور میں ہے لیکن اس کا ماضی خطِ تقسیم کے دوسری طرف رہ گیا ہے۔ ناول میں صابرہ اور نیم کے ایک پیڑ کو علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ انتظار حسین کے کردار سریندر کے خط کا یہ جملہ بھی قابل توجہ ہے کہ:

"یہاں پیچھے رہ جانے والے بوڑھوں کو دیکھ کر میں نے یہ جانا کہ مسلمان
کی تہذیب میں قبر کتنی بڑی طاقت ہے" (6)

جیلانی کامران نے ہجرت کا احساس لیے ادب کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

"ہجرت صرف مقام کے بدلنے کا نام نہیں بلکہ ذہن کے افق کے بدلنے
کا نام بھی ہے"(7)

تہذیبی و ثقافتی ناولوں کی بات چلی ہے تو مستنصر حسین تارڑ کا "بہاؤ" اس حوالے سے اہم ناول ہے۔ اسے بجا طور پر اردو کا ایک بڑا ناول کہا جا سکتا ہے۔ یہ ایسا شاہکار ناول ہے جو اپنے اندر صدیوں پرانے جہانِ رنگ و بو کو سموئے ہوئے ہے۔ اس ناول میں حیران کن چیز مصنف کا مضبوط تخیل ہے جو پانچ ہزار سال پہلے کی تہذیب کو ہماری آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔ اس ناول میں تخلیقی دریافت تباہی ہے

جو بالکل منفرد ہے۔ایک تباہی فطری ہے جو آندھی، طوفان، سونامی کی صورت روئے زمین پر ظہور پذیر ہوتی ہے۔ جیسے ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم کا گرایا جانا اور عراق اور افغانستان میں فاسفورس اور ڈیزی بم پھینکنا۔ لیکن مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ناول "بہاؤ" میں جس تباہی کا ذکر کیا ہے وہ ان دونوں اقسام کی تباہی سے ہٹ کر ہے۔ وہ نہ فطرت لاتی ہے، نہ انسان بلکہ غیر محسوس انداز میں آتی ہے۔ یہ تباہی کا ایک الگ سا انداز ہے کہ دریا آہستہ آہستہ اتنا خشک ہو جاتا ہے کہ زندگی تعطل کا شکار ہو جاتی ہے۔ حیوانات مر جاتے ہیں، کچھ دنیا سے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتے ہیں۔ مگر انسان واحد حیوان ہے جو محفوظ رہتا ہے۔ بہاؤ انسانی زندگی کا ترجمان ناول ہے۔ اس کی اہم ترین بات یہ ہے کہ انسان اپنی تہذیب اور ثقافت کو مصنوعات کے ذریعے آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑ جاتا ہے جیسے برتنوں پر اس وقت کا فنکار پھول اور بیل بوٹے بناتا تھا تاکہ اپنے فن اور تہذیب کو آنے والے لوگوں کے لئے محفوظ کر سکے۔

ساڑھے پانچ سو صفحات پر مبنی ناول "نیلی بار" بھی تہذیبی ناولوں کی اہم کڑی ہے. نیلی بار میں قیام پاکستان سے لے کر تقریباً ساٹھ برس کی تاریخ کو پس منظر میں رکھا گیا ہے اس میں باروں کے سبھی رنگ ڈھنگ، آب و ہوا، فصلیں، اجناس، موسیقی، گیت، ماہیے، دوہڑے لوک کہانیاں اور مقامی فلسفہ ان سب کو محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مٹتی ہوئی تہذیب و ثقافت اور طرز بود و باش کی جزئیات اور تفصیلات موجود ہیں جن پر وقت کے ساتھ جدت کا رنگ آ رہا ہے۔ اس کی زبان و اسلوب، مکالمے، معاشرت ہر چیز پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

تہذیبی اور ثقافتی ناولوں کی بات کی جائے گی تو محمد اقبال عابد کے ناول "مانگی ہوئی محبت" کا ذکر بھی ضروری ہے۔ "مانگی ہوئی محبت" میں رچنا تہذیب کے مرکزی شہر تلمبہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ تلمبہ کی تاریخ قدیم، دلچسپ اور عبرت آمیز ہے۔ تلمبہ گردشِ دوراں کے کئی نشیب و فراز کے بعد آج بھی اپنی بقا کی تلاش میں سر گرداں ہے۔ شہر کے آس پاس رونق اور گہما گہمی نظر آتی ہے۔ لیکن اس کی عظمت رفتہ

قصہ پارینہ بن چکی ہے۔ ثقافت کسی قوم کے تمام افراد کی مشترکہ سرگرمیوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ کسی فرد واحد کی نہیں پوری قوم کا مشترکہ ورثہ ہے۔ ثقافتی رجحانات سے تمدنی سلیقہ اور معاشرتی قرینہ مراد لیا جاتا ہے۔ ثقافتی رجحانات کے زمرے میں کسی قوم کی شائستگی، پختہ عادات وروایات، سماجی رسومات، اخلاقی اقدار اور معاشرتی معاملات وغیرہ آتے ہیں۔

ثقافت دستکاریوں، مصنوعات، رسوم، خیالات، عادات اور اقدار پر مشتمل ہے مگر یہ ثقافت کے وہ عناصر ہیں جن کی وجہ سے اس کی ہیئت متشکل ہوتی ہے۔ یہ بذاتِ خود قوت نہیں بلکہ اس کا سرچشمہ مذہب، قوانین اور اخلاقی قاعدے ہیں۔ چنانچہ تمدن کا اقتصادی نظام، قوانین، مشاغل، آرائش وزیبائش، رواج الغرض ہر وہ چیز جو فرد کی اصلاح اور ترقی کے لیے مفید نظر آئے ثقافتی رجحانات میں شامل ہے۔ ترقی پسندی، تاریخی، علاقائی، تجریدی، تہذیبی یا رومانوی اردو ناول خواہ کسی بھی رجحان کے تحت لکھا گیا ہو۔

یہ بات روزروشن کی طرح عیاں ہے کہ اس میں فرد یا معاشرے کو پیش کیا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر دور کے ادب میں اس دور کی تہذیب اور ثقافت کے مظاہر کو دیکھا جاسکتا ہے۔ لوگوں کے مل جل کر رہنے سے رسوم ورواج نے جنم لیا۔ گزرتے وقت نے ان رسموں رواجوں کو اقدار اور روایات کا روپ دے دیا۔ اگر غور کیا جائے تو روز اول سے ہی انسان اپنے آباؤ اجداد کے نقش قدم پر چلتا آیا ہے۔ باہمی روابط، طرزِ زندگی، عادات واخلاق، رسوم ورواج اور ذہنی رجحانات کے مروجہ معیار ہی کسی معاشرے کی سماجی اقدار ہوتی ہیں۔

برصغیر کی تہذیب و تمدن پر بیرونی حملہ آوروں نے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں دراوڑوں، آرائیوں، منگولوں، مقدونیوں اور مسلمانوں کی آمد یہاں کے رہن سہن، بول چال، زبان اور ثقافت پر اثر انداز ہوئی جس کے نتیجے میں ایک مخلوط معاشرہ تشکیل پایا۔ ہر قوم اپنے ملک یا عقیدے کے رسم ورواج کو پسند کرتی ہے اور اسی میں خوش رہتی ہے کیونکہ جن باتوں کی بچپن سے عادت ہو جاتی ہے وہی درست اور دل کو بھلی لگتی ہیں۔ لیکن اگر ہم اسی پر اکتفا

کریں تو اس کے معنی یہ ہو جائیں گے کہ برائی اور اچھائی حقیقت میں کوئی چیز نہیں ہے بلکہ صرف عادت پر موقوف ہے۔ جس چیز کا رواج ہو گیا اور عادت پڑ گئی وہی اچھی ہے اور جس چیز کا رواج نہ ہوا، عادت نہ پڑی بری ہے۔

رسم و رواج چونکہ رائج ہوتے ہیں، سب ویسا کر رہے ہوتے ہیں اس لیے کوئی اس کے کرنے پر انگلی نہیں اٹھاتا، عیب نہیں دھرتا۔ لیکن ایسا کرنے سے وہ رواج اگر برا ہے تو اچھا نہیں بن جاتا۔ ضرورت ہے تو فقط یہ کہ ایسی رسومات کو اچھائی اور برائی کے پلڑے میں رکھ کر تولیں۔ایک غیر ملکی کہاوت ہے "عمر رسیدہ کے منہ سے بدبو کے بھبھکے ہی اٹھتے ہوں تب بھی اسے سنبھال کر رکھو کیونکہ وہ قدامت کے دروازے کھولنے کے لیے چابی کا کام دیتا ہے۔" یہ رسوم و رواج بھی ہماری اقدار اور روایات کی کڑیاں ہیں۔اپنے ماضی اور حال کے حوالے سے، ہماری "ناک" کا مسئلہ ہیں۔ لہذا بہت سے رسوم و رواج بھلے نہ بھی لگتے ہوں تب بھی ان سے چھٹکارا پانا مشکل ہے۔ناول "اندھیرا پگ" چونکہ ایک تہذیبی ناول ہے اس لیے اس میں جابجا راجستھانی تہذیب و ثقافت بکھری نظر آتی ہے۔

ناول "اندھیرا پگ" کے فنی اور فکری تجزیے سے پیشتر ضروری ہے کہ ناول کے فن، اس کی روایت اور راجستھان میں ناول کے ارتقاء پر بات کی جائے۔

ناول کا فن:

ناول اور زندگی کا فن ایک دوسرے کے اس قدر قریب ہیں کہ ناول کو زندگی اور زندگی کو ناول کے آئینے میں دیکھ لینا دشوار نہیں۔ یہ سماج اور فطرت کے خلاف فرد کی جدوجہد کا بیانیہ ہے۔ناول نگاری کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب انسانی تہذیب نے پختگی کی منازل طے کرنا شروع کیں۔ان بدلتے ہوئے حالات کا تقاضا تھا کہ قصہ نگار اپنے عہد کے انسانی وسائل و معاملات کا بھرپور مطالعہ کرے۔

ناول اور اس کا اسلوب:

ناول ایک نثری صنف ادب ہے۔ ناول کی روایت، اردو میں زیادہ قدیم نہیں ہے۔ اس کے باوجود آج اردو ناول جس مقام پر ہے وہ زیادہ مایوس کن نہیں۔ مغرب میں عرصے سے ناول کی روایت مستحکم تھی اس لیے وہاں غیر معمولی ناول لکھے گئے۔ ہمارا ناول ایک زمانے تک داستان اور رومانیت کی دنیا میں بھٹکتا رہا۔ انیسویں صدی کے اواخر تک یہ داستان کی شکل میں یہ موجود تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں "امراؤ جان ادا" جیسا شاہکار ناول تخلیق ہوا تو ہمارے ناول کا رشتہ مغربی ناول کی روایت سے جا ملا۔ مرزا ہادی رسوا کا ناول "امراؤ جان ادا" اردو ناول کی روایت میں سنگ میل ثابت ہوا۔

ناول قصہ گوئی کی ایک قسم ہے۔ یہ ریڑھ کی ہڈی کی طرح آگے بڑھتا ہے۔ ہر قاری اس تجسس میں ہوتا ہے کہ آگے کیا ہوا؟" یہ ایک عالمگیر عنصر ہے۔ یہی سبب ہے کہ کہانی ناول کی روح کی حیثیت رکھتی ہے اور زمان ترتیب سے دیئے ہوئے واقعات کا بیان ہے۔ مثلاً ناشتے کے بعد دوپہر کا کھانا، ہفتے کے بعد اتوار اور کھانے کے بعد یونیورسٹی کا بیان ہی حسن ترتیب ہے۔ کہانی کی خوبی یہ ہے کہ وہ سننے یا پڑھنے والوں میں آنے والے واقعات کے بارے میں اگر تجسس پیدا نہ کرے تو وہ کہانی کی کمزوری ہے۔

ناول کو موجودہ سیرت، صورت، اور ہیئت تک پہنچنے میں ارتقا کی کئی منازل سے گزرنا پڑا ہے۔ ناول کی بے شمار اصطلاحیں اور تعریفیں ملتی ہیں۔ مختلف زبان وادب کے ناقدین نے اپنے طور پر ناول کی تعریف کرتے ہوئے اس سے متعلق اپنے خیالات و نظریات کا اظہار کیا ہے۔ یہ تعریفیں اتنی وافر، متضاد اور مختلف ہیں کہ تمام کا احاطہ کرنا ایک الگ موضوع ہے۔ اس لیے یہاں مختصر طور پر اس صنف کی اجمالی تعریف اور انفرادیت کے تعین کی کوشش کی جائے گی۔ ناول کا لفظ اطالوی زبان سے مشتق ہے۔

ای۔ ایم فاسٹر کے مطابق:

"سب سے پہلے یہ لفظ چودھویں صدی میں سامنے آیا۔ اس کی اصل Novella Storia ہے۔ یہ اصطلاح تازہ کہانی کا مفہوم رکھتی تھی لیکن بعد میں ناول کا لفظ کہانی کے لیے مخصوص ہو گیا جو نثر میں لکھی گئی ہو اور جس میں رومانی اثرات ملیں۔"(8)

برصغیر میں اردو ناول نگاری مغرب سے آئی۔ اردو ناول نگاری پر انگریزی کے ساتھ ساتھ روسی، فرانسیسی، ہسپانوی اور امریکی ناول نگاروں نے گہرے اثرات مرتب کیے۔ اردو ناول نگاروں نے انگریزی ہی کی مدد سے دوسرے ممالک کی زبانوں سے استفادہ کیا۔ ناول کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ناقدین کی رائے کا جائزہ لیا جائے۔ ناول کے بارے میں ای۔ ایم فاسٹر لکھتے ہیں:

"تمام بڑے ناول نگار، مصنفین اور کہانی گو اس نکتے پر اتفاق کرتے ہیں کہ ناول کا آغاز وار تقاء داستان گوئی سے ہوا ہے"(9)

والٹر ایلن کے مطابق:

"(ترجمہ): ہر اچھے ناول کی پہچان اس کی حقیقت نگاری ہے۔ اس کی غرض زندگی کی نمائش ہے اس کو حقیقی زندگی اور سچے واقعات پیش کرنے چاہئیں۔ نہ کہ ایسی زندگی اور ایسے واقعات جو کتابوں سے لیے گئے ہوں۔ اس لیے اسے تجربہ، مشاہدہ، نئے خیال اور درست افواہ کے علاوہ کچھ نہ ہونا چاہیے۔"(10)

ناول میں قصے کو نثر میں اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ وہ زندگی کا عکاس ہو اور اس کی بنیاد مشاہدہ، مطالعہ اور تجربہ ہے۔ یہ درست ہے کہ ناول کی اہمیت دوسری اصناف سے زیادہ ہے کیونکہ یہ انسانی زندگی کی مکمل تصویر پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد ناول کو تعلیمی مقاصد اور تبلیغی نکتہ نظر سے اہم خیال کرتے ہیں۔ مرزا ہادی رسوا اس سے زندگی کے مطالعے کا کام لیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ناول سے انسانی زندگی کی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ناول کے نقادوں میں ڈاکٹر یوسف سرمست کی رائے سے بھی انکار ممکن نہیں۔ وہ کہتے ہیں:

"اگرچہ ناول کا لفظ اور ہئیت انگریزی ادب کے ذریعے ہندوستان آئے لیکن اصل میں ہندوستان کے وہ مخصوص حالات تھے جنہوں نے یہاں کے ادیبوں کو ناول نگاری کی طرف راغب کیا۔ حقیقت میں یہ ایک ضرورت تھی کیونکہ کہانی ہر زمانے میں ادب کی مقبول ترین صنف رہی ہے۔"(11)

ناول کی اقسام:

فنی اعتبار سے ناول کی کئی اقسام ہیں جن میں سے کچھ کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

اخلاقی ناول:

کہانی میں متن کے اعتبار سے اخلاقی موضوعات کو شعوری طور پر شامل کیا جائے تو ایسے ناولوں کو اخلاقی ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ایسے ناولوں میں غالب رجحان اخلاقیات کا ہوتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ تمام تر تحریر صرف پند و نصائح کا پلندہ بن کر رہ جائے۔ اردو زبان میں راشد الخیری اور ڈپٹی نذیر احمد نے اسی طرز کے ناول لکھے ہیں۔

معاشرتی ناول:

آداب زندگی اور طرز معاشرت سے تعلق رکھنے والے ناول معاشرتی ناول کہلائیں گے۔ ایسی تحریر میں رکھ رکھاؤ اور معاشرت کے اصولوں پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ ضروری نہیں کہ ناول کا ہر کردار "آداب معاشرت" کا پاسدار ہو۔ معاشرتی و سماجی طرز کے ناولوں کو ہمارے ہاں بڑی پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔

اصلاحی ناول:

فرد، عوام، سماج یا معاشرے میں پیدا ہونے والی خرابیوں کو دور کرنے کے مقصد کے تحت لکھے جانے والے ناولوں کو اصلاحی ناول کا نام دیا جاتا ہے۔ ایسے ناول عموماً" مذہبی اور اخلاقی مسائل پر بھی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ عام طور پر اصلاحی ناول ڈھکے چھپے انداز میں کسی خاص مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اصلاحی ناول عموماً" برائی کی نشاندہی کرنے اور اسے روکنے کے لیے لکھے جاتے ہیں اس لیے اس میں اچھائی اور برائی سے متعلق دونوں قسم کے کردار پائے جاتے ہیں۔

تاریخی ناول:

تاریخی شہادتوں، شخصیات اور واقعات کو بنیاد بنا کر لکھے جانے والے ناول تاریخی کہلاتے ہیں۔ ایسے قصے اور کہانیوں پر تاریخی ناولوں کا اطلاق ہوتا ہے جو تاریخی واقعات کے پس منظر میں عشق و محبت کی داستانوں کو فروغ دیتے ہیں۔ کیونکہ تاریخی ناول میں دلچسپی کے لیے عشقیہ قصے کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ اردو میں اسلامی تاریخ پر مبنی کئی واقعات کو تاریخی ناولوں کی صورت میں پیش کیا گیا اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ نسیم حجازی اور عبدالحلیم شرر کے ناول اس موضوع کی تکمیل کرتے ہیں۔

سائنسی ناول:

سائنسی تجربات، واقعات اور معاملات کو بنیادی حیثیت دے کر عشقیہ اور رومانی انداز میں لکھے جانے والے ناول سائنسی ناول کہلاتے ہیں۔ سائنسی موضوعات، ترقیات کے علاوہ ایجادات کے پس منظر میں لکھی جانے والی کہانیاں بھی سائنسی ناول میں شمار کی جائیں گی۔ موضوعاتی اعتبار سے ایسی تمام طویل کہانیوں کو سائنسی ناول میں شمار کیا جائے گا۔ جو فنی طور پر ناول کے اصولوں کی پابند ہوں لیکن ان کا قصہ دور جدید کی سائنس اور ٹیکنالوجی کے اطراف گھومتا ہے۔

تہذیبی ناول:

کسی علاقے کی تاریخ، ثقافت، تمدن، رہن سہن، تہوار اور رسم و رواج کے حامل ناول کو تہذیبی ناول میں شمار کیا جائے۔ دراصل تہذیبی ناول ایک پھیلی ہوئی بڑی تصویر ہے جس میں وہ عہد متشکل ہو کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ ناول کی کہانی اور اس کے کرداروں کی سیرت و شخصیت کو ہماری عصری زندگی کا جیتا جاگتا نمونہ ہونا چاہیے۔ ناول میں زبان کسی ماجرے کا وسیلہ ہوتی ہے۔ کسی بھی ناول کے لیے تخیل، کہانی، اسلوب اور زبان اہمیت رکھتے ہیں۔ اب یہ ہر فنکار کی اپنی استعداد پر منحصر ہے کہ وہ ناول کو اثر پذیری سے مالا مال کرنے کے لیے کون سے اقدام اٹھاتا ہے۔ ایک کامیاب ناول نگار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے قارئین کے دلوں کو موہ لے اور وہی اسلوب اور طرز نگارش اختیار کرے جس سے قاری لطف اندوز ہو سکے۔

علامتی ناول:

علامت کا انگریزی متبادل لفظ symbol ہے جس سے مراد وہ لفظ ہے جو ظاہری مفہوم سے ماورا ہو، قطعی معنویت سے عاری ہو۔ علامت نگاری انیسویں صدی کے آخری ربع میں حقیقت پسندی کے رد عمل کے طور پر ابھرنے والا طرز عمل ہے جسے بطور تکنیک افسانوی ادب میں استعمال کیا گیا ہے۔ انتظار حسین نے ناول اور ممتاز شیریں نے افسانے میں علامت کو استعمال کیا۔ بانو قدسیہ کے ناول "راجہ گدھ "میں بھی علامت کو استعمال کیا گیا ہے۔

تجریدی ناول:

کچھ لوگ عام طور پر علامت اور تجریدیت کو ایک ہی چیز تصور کر لیتے ہیں مگر دونوں کی تکنیکس مختلف ہیں۔ تجریدیت بنیادی طور پر مصوری کی اصطلاح ہے جس میں فنکار کے تاثرات مختلف رنگوں کے ذریعے پیش کیے جاتے ہیں۔ ہر وہ شے جو وجود نہ رکھتی ہو، مجرد ہو، تجریدیت کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔ یہ کوئی تصور بھی ہو سکتا ہے اور

صورت حال بھی۔ تجریدیت سے مراد "بے صورت" کے ہیں۔ تجریدی کہانیوں میں عام کہانیوں کی طرح موضوع نہیں ہوتا۔اس کا تعلق شعور سے لاشعور کی طرف ہوتا ہے

حقیقت نگاری پر مبنی ناول:

فلسفہ سے تعلق رکھنے والی اس اصطلاح کا آغاز فرانس سے انیسویں صدی میں ہوا۔اس کے تحت اصل بات کی طرف خاص توجہ دی جاتی ہے۔ ادب میں اشیاء ،اشخاص اور واقعات کو کسی قسم کے تعصب، موضوعیت اور روحانیت سے آلودہ کیے بغیر دیانت اور صداقت سے پیش کرنے کا نام حقیقت پسندی یا حقیقت نگاری ہے۔ منشایاد اور احمد ندیم قاسمی جیسے ادیبوں نے اپنے ناولوں میں حقیقت نگاری کو پیش کیا ہے۔

نفسیاتی ناول:

فرائیڈ کا نفسیاتی نظریہ تحلیل نفسی ہے۔ فرائیڈ نے یہ طریقہ اعصابی مریضوں کے لئے وضع کیا تھا۔اس تکنیک کے تحت لاشعور کی تفہیم و تشریح سائنسی بنیادوں پر کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عملی زندگی میں اس کی خاص اہمیت ہے۔ انسانی مزاج اور اس کے ذہن کو سمجھنے کے لئے نفسیاتی ناول لکھے گئے۔ انسانی رویوں کو سمجھنے کے لیے تگ ودو کرنا نفسیات ہی کے زیرِاثر ہے کیونکہ تحلیل نفسی سے انسانی رویے،ذہنی کیفیت اور ذہنی افعال کو پرکھنے کے لئے بڑی مدد ملتی ہے۔ انیس ناگی، مظہر الاسلام،اشفاق احمد، بانو قدسیہ ،طاہرہ اقبال نے اس تکنیک میں ناول لکھے ہیں۔

"نیلی بار" معروف افسانہ نگار اور ماہر تعلیم طاہرہ اقبال کا ناول ہے۔ طاہرہ اقبال رچناوی تہذیب و ثقافت کے علاقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ "نیلی بار" ان کا پہلا ناول ہے جو پہلے سہ ماہی "اجرا" کراچی میں قسط وار چھپتا رہا۔ 2017ء میں اس ناول کو دوست پبلی کیشنز اسلام آباد نے چھاپا ہے۔اس ناول کو دس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں "بار" کے رنگوں، موسم، لوگوں کے رسم و روایات، میلے ٹھیلوں، طرزِ معاشرت اور

عادات واطوار کا ذکر ہے۔اس ناول میں ناول نگار کے مشاہدے کی گہرائی سطر سطر جلوہ ہائے رنگ بکھیرتی واضح نظر آتی ہے۔ مصنفہ نے ان مناظر کو کچھ یوں بیان کیا ہے کہ نیلی بار کے علاقے کی دیسی خواتین اور مردوں کی تصویر نگاہوں کے سامنے رقص کرنے لگتی ہیں۔ ناول کا پہلا باب بھی "بار کے رنگ ،موسم اور لوگ" کے عنوان سے ہے۔ یہاں کا اندازِ زیست،ان کے لباس، گردو پیش میں بسنے والی دوسری جاندار اشیاءاور درختوں اور پودوں کا منظر نامہ اتنا دلچسپ اور معنی خیز ہے کہ ناول کی ابتدا ہی سے قاری ناول نگار کی انگلی تھامے نیلی بار کے دل نشین علاقے کی سیاحت کرنے چل پڑتا ہے۔ناول کا پہلا باب تقسیم ہند کے بعد پنجاب کی معاشرت کا آئینہ دار ہے۔سیاسی اور تاریخی شعور کی تلاش ابتداء ہی سے ناول کے بیانیے کا حصہ بنتا ہے۔ کہیں اندازِ بیان میں تلخی آجاتی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ مصنفہ طاہرہ اقبال غریبوں کے معاشی استحصال پر پرزور احتجاج کر رہی ہیں۔ سست اور کاہل لوگوں کے جسمانی اور معاشی استحصال پر شکوہ شکایت نہ کرنے اور ہر دکھ مصیبت پر آنکھیں اور کان بند کر کے اللہ کی طرف سے لکھا سمجھ کر چپ رہنے پر کرب آمیز طنز اور دلسوزی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ طاہرہ اقبال کی ژرف نگاہی کا یہ بین ثبوت ہے کہ انہوں نے ایک طرف پنجاب کی طرزِ معاشرت، طرزِ لباس، اندازِ زیست اور معاشی استحصال کی تصاویر کشی کی ہے تو دوسری طرف دیہی معاشرت میں بسی تہذیب کی عکس بندی کی ہے۔ دیہی شادی میں لڑکی اور لڑکے کے ملنے اور عہد و پیماں کے مناظر فطری اور حقیقی ہیں۔ طاہرہ بے باک قلمکار کے طور پر معروف ہیں ان کی نثر جنسی شعور کی لذت انگیز چاشنی سے لبریز نظر آتی ہے۔ کسی منظر یا جسمانی اعضاء کی تصویر کشی بعض اوقات اتنی مکمل اور دلیرانہ انداز میں کرتی ہیں کہ جملوں کی بنت میں تصوری کاوش کارفرما نظر آتی ہے۔ غریبوں کی نوجوان لڑکیوں سے جنسی حظ اٹھانا، ان کی عصمت دری کرنا امیر زادوں کے لئے کوئی نئی بات نہیں۔ غریبوں کی ازلی بے بسی اور اپنے حق کے لیے آواز اٹھانے کے بجائے ظالم کو مظالم سہنے والوں کی بے حسی، بے بسی اور سر جھکا کر سب ظلم سہہ جانے کی کیفیات کو طاہرہ نے تلخ حقیقت نگاری کے ذیل میں عمدگی کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ معاشرے کا سب سے کمزور طبقہ عورت ہے اور جب یہ عورت غریب گھرانے کی ہو تو پھر اور بھی مظلوم ہوتی ہے۔ بھیڑ بکری سے بھی کم قیمت کی حامل یہ مخلوق مردوں کی عیاشیوں کے لئے ہی کارآمد سمجھی جاتی ہے۔

طاہرہ اقبال نے نیلی بار کے علاقے کی مخصوص زبان میں جو'' جانگلی'' یا'' رچناوی'' کہلاتی ہے، کرداروں سے یہی زبان بلوائی ہے۔ مردوں اور عورتوں کا مخصوص لہجہ اور تلفظ اس علاقے کی سوغات ہے۔ یہ زبان اس علاقے کی تہذیب وثقافت کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ غرض رچناوی تہذیب وثقافت کی بھرپور ترجمانی کرتے اس ناول میں زندگی کی توانائی موجود ہے۔ انہوں نے نیلی بار اور گنجی بار کے علاقے کو مکمل ثقافتی رعنائی کے ساتھ اس ناول میں پیش کیا ہے اور مٹتی ہوئی تہذیب کو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

ناول کے فن کی تشکیل وتعمیل میں درج ذیل عناصر ترکیبی کی اہمیت تسلیم شدہ ہے۔

- قصہ یا کہانی
- پلاٹ
- کردار نگاری
- مکالمہ نگاری
- زمان ومکان
- منظر کشی
- جذبات نگاری
- زبان وبیان (اسلوب)
- فلسفہ حیات (مرکزی خیال)

ناول کا سب سے اہم عنصر قصہ یا کہانی ہے۔ عام طور پر ناول محض قصہ ہی سمجھا جاتا ہے اور عام ناول میں قصہ کے سوا کچھ ہوتا بھی نہیں۔ مگر اعلیٰ ناول بھی قصہ کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا۔

ہر قصہ میں شروع کا ایک واقعہ ہوتا ہے، پھر کچھ درمیانی واقعات ہوتے ہیں اور آخر میں کوئی خاص واقعہ جسے انجام یا نتیجہ کہا جاتا ہے۔ قصے میں زمانی ترتیب ضروری ہے۔ جیسے پیدائش، لڑکپن، جوانی، ادھیڑ عمری اور بڑھاپا یا

سکول، کالج اور پھر یونیورسٹی۔ کہانی کا عنصر یا قصہ پن ہی ہے جو شروع سے آخر تک قاری کی دلچسپی برقرار رکھتا ہے۔ قاری کو جب تک تحریر میں دل چسپی نہیں ہو گی وہ ساتھ کیونکر چلے گا۔ مثلاً شاعری میں ایک لطف ہوتا ہے جو پڑھوانا ہے۔ انشائیہ یا مضمون میں بھی ایک شگفتگی کی کیفیت ہوتی ہے۔ مگر افسانے یا ناول میں جو ایک قصے کا ''تار'' اور سسپنس ہوتا ہے کہ آگے کیا ہوا؟۔۔ وہ پڑھواتا ہے۔ اگر وہ ''تار'' نکال دیں تو دلچسپی ختم ہو جائے۔

منیر ابن رزمی ''مانگی ہوئی محبت'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''قرۃ العین حیدر کے ''آگ کا دریا''، بانو قدسیہ کے ناول ''راجہ گدھ'' اور ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی کے ''کئی چاند تھے سر آسماں'' سے اسے جدید ناول نگاری کے عہد تک۔۔۔۔۔۔ ''کہانی پن'' ہی قرات کے لیے ذہنی غذا بنتا ہے''(12)

ناول میں قصہ کی بنیاد انسانی زندگی پر ہوتی ہے اور اس میں روز مرہ کے واقعات بیان ہوتے ہیں۔ مذکورہ ناول کی کہانی بظاہر عام سی لگتی ہے لیکن ناول کے تفصیلی مطالعہ کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ناول کی بنیادی کہانی کے ساتھ تاریخ، تہذیب و ثقافت، رہن سہن اور بول چال کے انتظام کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ ''اندھیرا پگ'' میں بنیادی نقطہ راجستھانی معاشرے کی پسی ہوئی عورت اور اس کے مصائب و آلام ہیں۔

ڈاکٹر احمد صغیر ''اردو ناول کا تنقیدی جائزہ 1980ء'' کے بعد میں رقم طراز ہیں:

> ''اندھیرا پگ'' ثروت خان کا ناول ہے جو 2005ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں راجستھان کے ادنیٰ طبقے کے حالات زندگی کو اجاگر کیا گیا ہے۔ آج بھی راجستھان میں مردانہ سماج حاوی ہے اور عورت محض جنسی تعلقات بنانے اور بچہ پیدا کرنے کے علاوہ کچھ نہیں سوچ سکتی یہاں تک

کہ عورتوں کی تعلیم پر بھی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ بہت ساری دقیانوسی
رسم ورواج آج بھی اس سماج میں دیکھنے کو ملتی ہے"(13)

ناول دراصل واقعہ نگاری ہے۔ ناول کی تعمیر میں مختلف واقعات سے مدد لی جاتی ہے۔ مگر واقعات کی بہتات ناول کو غیر دلچسپ، پھیکا اور طویل بنادیتی ہے۔ کسی شخصیت کے کردار سے متعلق وہی اہم اور منفرد واقعات بیان کرنا چاہییں جن سے موضوع کے لحاظ سے چھپے ہوئے گوشے سامنے آئیں اور انفرادیت نمایاں ہو۔

قصے میں واقعات کا انتخاب، اس کے بعد ان میں ربط و تسلسل اور توازن کا سلیقہ بے حد ضروری ہے تاکہ قاری ان کے شامل ہونے سے الجھن محسوس نہ کرے۔ قصے میں واقعات کو دلکش انداز میں بیان کیا جانا چاہیے کیونکہ قصے کی اثر انگیزی اور دلچسپی کا انحصار بڑی حد تک اس پر ہوتا ہے کہ واقعات کو کس ڈھنگ سے بیان کیا گیا ہے۔ بیان اس طرح ہونا چاہیے قاری کو واقعہ اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا دکھائی دے۔ قصے میں واقعات کو ایک دوسرے سے باندھنے والا تار کسی بھی وقت ٹوٹنا نہیں چاہیے بلکہ یہ تار جتنا طویل ہو گا اور واقعات جتنے اچھے گندھے ہوں گے اتنا ہی قصّہ دلچسپ ہو گا۔ قصہ میں انتظار یا تجسس کی خلش خاص چیز ہے۔ ناول اندھیرا پگ روپی کا قصہ ہے جسے ثروت خان نے اپنے لفظوں میں بیان کیا ہے۔

ماہرین ادب نے قصہ کی کئی قسمیں بتائی ہیں

- **خط مستقیم کی طرح**

اس طرح کے قصوں میں واقعات خط مستقیم کی طرح کسی ایک نقطہ سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتے ہیں مثلاً ہیرو اور ہیروئن کے علاوہ واقعے کا تعلق کسی اور کے بجائے انہیں تک محدود رہتا ہے۔

- **مسلسل کی طرح**

اس طرح کے قصوں میں واقعات تین لوگوں کے درمیان بڑھتے ہیں مثال کے طور پر ہیرو، ہیروئن اور ولن

• دائرہ کی طرح

ایسے قصے میں واقعات کسی نقطہ نظر سے شروع ہو کر گھوم پھر کر اپنے نقطہ آغاز پر پہنچ کر ختم ہو جاتے ہیں۔عام طور پر دوسری اور تیسری قسم کے قصے زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں۔

قصے زندگی سے قریب ترین بھی ہوتے ہیں اور بعید از قیاس بھی۔زمانہ قدیم کی داستانیں بعید از قیاس ہی ہوتی تھی لیکن جو خصوصیات ناول کو داستان یا افسانے سے ممتاز بناتی ہیں وہ حقیقی زندگی کی ترجمانی ہے۔اس میں زندگی کے تقاضے نئ قدریں ان کے برتنے کا سلیقہ ہمہ جہت سچائی کا ادراک پایا جاتا ہے۔یہ نہ ہو تو واقعات اپنی ادبی حیثیت کھو دیتے ہیں۔

زمان و مکان کا تصور بھی ناول کے لیے ایک لازمی جز کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ دنیا کا ہر گوشہ اپنی انفرادی خصوصیت اور پہچان رکھتا ہے اسی طرح ہر قوم اور طبقے کی اپنی تہذیبی ثقافتی اور سماجی پہچان ہوتی ہے جو وقت اور حالات کے ساتھ تبدیل بھی ہوتے رہتے ہیں۔زماں و مکاں کی ان تبدیلیوں کے ساتھ انسانی جذبات واحساسات میں بھی تبدیلیاں ہوتی جاتی ہیں جس کا خیال رکھنا ناول نگار کے لیے بے حد ضروری ہے۔

بقول پروفیسر احتشام حسین:

"زماں و مکاں ہی حقیقت کو ناپنے کے لئے آلے ہیں۔ لیکن خود زماں و مکاں کی حقیقت پر نگاہ رکھنا بھی ضروری ہے ناول پڑھتے ہوئے ہمیں وقت کی اس رفتار کو محسوس کرنے کی ضرورت ہے جس سے ناول کے واقعات اور کردار گزر رہے ہیں۔ یہ وقت بھی حقیقی ہے اور اس کے اندر بھی واقعات کی تخلیق ہو سکتی ہے۔۔۔۔ اگرچہ یہ حربہ ناول نگار کے ہاتھوں سے چھین لیا جائے تو بعض اوقات ناول کی ترتیب میں زبردست خلاء واقع ہو جانے کا خطرہ ہے"(14)

ناول نگار کے لیے زماں و مکاں کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے کیونکہ زماں و مکاں کی ذرا سی تبدیلی کرداروں کے حرکت و عمل کے ساتھ سماجی مزاج وماحول میں بھی تبدیلی آنے لگتی ہے۔ان حالات میں ناول نگار کی بے توجہی قصے کو کمزور کر دیتی ہے۔

ناول کے پیش کرنے میں اہم وسیلہ زبان وبیان ہے۔ کرداروں کی حرکات وسکنات اور جذبہ فکر زبان وبیان کے ذریعے ہی سامنے آتے ہیں۔اچھے ناولوں میں زبان قصے کے مزاج کے مطابق ہوتی ہے۔ کسی مزاحیہ قصے کو سنجیدہ زبان میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ مسرت کی زبان اظہار غم کے لیے نامناسب ہوتی ہے۔ تخیل کی نزاکتوں اور فنی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ موزوں الفاظ، متوازن تراکیب اور فقرات بھی ضروری ہوتے ہیں۔ناول میں زبان کے استعمال کے حوالے سے ڈاکٹر اسلم آزاد لکھتے ہیں:

> "زبان دراصل وہ بنیادی قوت ہے جس پر واقعہ نگاری، کردار نگاری، معاشرہ نگاری اور مکالمہ نگاری کا پورا دارومدار رہتا ہے صاف و سادہ اور طاقتور زبان ہی ان اجزاء کو یہ حسن وخوبی برتنے میں کامیابی دلا سکتی ہے"(15)

زبان ہی کے حوالے سے ایک اور جگہ سید محمد عقیل رقمطراز ہیں:

> "ناول میں زبان محض اظہاریت کو سہارا دینے کے لیے استعمال ہوتی رہتی ہے ورنہ اصل زور تو اس واقعہ، خیال اور پھر اس کہانی کی بنت، پیشکش اور اگر کرداری ناول ہے تو کرداروں کی کارکردگی پر ہوتا ہے۔ مگر کارکردگی کا بیان بھی تو ایک سلیقہ چاہتا ہے جس سے پڑھنے اور سننے والے کی دلچسپی بڑھے اور اس پر ناول نگار کی باتوں کا اثر اس طرح پڑے کہ حواس خمسہ متاثر ہوں اور قاری یا سامع کے اس ادبی ذوق کی تشفی ہو جو اس خاص دور کا ادبی ذوق ہو"(16)

ادب کی کوئی بھی صنف ہو اس میں زبان و بیان کی اہمیت بنیادی ہے۔ ناول بیانیہ نثری صنف ہے۔ زبان و بیان کے سہارے ہی ناول نگار کسی شخص کو چلتا پھرتا، ہنستا بولتا، مغموم دکھاتا ہے۔ وہ واقعات میں جان پیدا کرنے اور کردار کو حرکت میں لانے اور احساس کے قابل بنانے کے لیے الفاظ کا سہارا لیتا ہے۔ ناول نگار کو اپنے بیان میں زور پیدا کرنے کے لیے موزوں الفاظ، حسین تشبیہات، دلکش استعارات اور دوسرے معنوں سے مدد لینی پڑتی ہے تاکہ حقیقت کھل کر سامنے آئے اور ناول میں ادبی چاشنی بھی پیدا ہو۔

کسی بھی ناول کی خوشنمائی اور دل نشینی زبان و بیان یا اسلوب کی بدولت ہی ہوتی ہے۔ کرداروں کی حرکات و سکنات پیشکش، حالات و واقعات، جذبہ فکر اور شعوری نظریات کی ترجمانی زبان کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ گو بات کہنے کا فن فطری اور خداداد ہوتا ہے لیکن پھر بھی خیالات، قوتِ مشاہدہ اور وسعت مطالعہ کی بنا پر اسلوب دلآویز اور دلکش ہو گا۔ ناول نگار کی زبان پر گرفت ناول میں لطافت اور چاشنی پیدا کرتے ہیں۔ کرداروں کے اندازِ فکر کی آئینہ داری سماجی زندگی کی عکاسی، طرزِ احساس، باہم گفتگو، طبقاتی جرات اور واقفیت پسندی زبان و بیان کے باعث فطری جامعیت برقرار رکھتے ہیں اور واقعات کے تسلسل میں روانی آتی ہے۔ کرداروں کے اندازِ گفتگو میں سطحیت، تکلف اور پیچیدگی اس اسلوب میں مصنوعی پن پیدا کرتے ہیں۔ بے ساختہ لب و لہجہ کہانی کو فطری طور پر آگے بڑھانے میں مددگار ہوتا ہے۔ اگر زبان و بیان کو کسوٹی قرار دیا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ زبان و بیان یا اسلوب تخلیق کار کی شخصیت کا پرتو بھی ہوتا ہے۔ ناول نگار زبان و بیان کی بدولت قاری کو تحیر آمیز صورتوں سے گزارتا ہے اور بہت سے نظریاتی اور فلسفیانہ رموز و اوقاف اور نکات قاری کے شعور میں داخل کرتا ہے۔ اگر قاری ان سب کو سمجھ کر صورتحال کو جانچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو ناول نگار اپنی تخلیقی معراج پر ہوتا ہے اور ناول اعلیٰ فن پارے میں ڈھل جاتا ہے۔ اسلوب میں صرف خالص منظر کشی سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ جمالیات، جذبات اور

حقیقت کی پیشکش سے تفہیم کا سلیقہ پیدا ہوتا ہے۔ ناول کا موضوع کتنا ہی دلکش اور جاندار ہو اگر اس کا اسلوب، اس کی پیشکش اور زبان و بیان میں حسن اور لطافت نہ ہو تو قصہ بے جان ہو جاتا ہے اور ناول کی ناکامی کا سبب بنتا ہے۔

ڈاکٹر سہیل بخاری کہتے ہیں:

"انشاء پردازی کا کمال یہ ہے کہ الفاظ فقرے اور جملے ہمارے خیالات و جذبات کے اتار چڑھاؤ کا برابر ساتھ دے رہے ہیں۔ ناول نگار واقعات سے جو اثر قبول کرتا ہے وہ لفظوں اور جملوں کے ذریعہ ہی دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ اس لیے اثر پذیری کی صحیح صحیح ترجمانی واقعی عکاسی اس کے اسلوب، بیان کی دلکشی اور دل آویزی پر ہی منحصر ہے"(17)

زندگی کی بیکرانی اور ارزانی میں مقصد کے بغیر بقا ناممکن ہے۔ اس لئے مقصد حیات فرد کی حقیقی زندگی کا عکاس ہوتا ہے۔ ناول کیونکہ حقیقی زندگی کا پرتو ہوتا ہے اس لئے ناول میں فلسفہ حیات، نظریہ حیات یا مقصد حیات ایک خاص طریقے سے بیان کیا جاتا ہے۔

ہر وہ فرد جو کہانی کہتا ہو یا ذاتی تجربات و مشاہدات کو بیان کرتا ہو اپنا ایک اصولی یا نظریاتی نقطہ نظر رکھتا ہے۔ اس کو فلسفہ حیات بھی کہہ سکتے ہیں۔ ناول نگار زندگی کا بنظر غائر عمیق مطالعہ، مشاہدے کی باریکی، مطالعے کی حسیت، ذاتی تجربات، انسانی نفسیات کی روشنی میں کرتا ہے۔ اس لیے ناول نگار کا نقطہ واضح اور بامقصد ہونا چاہیے تاکہ قاری ابہام اور الجھاؤ کا شکار نہ ہو۔ مقصد حیات حقیقت پر مبنی ہونا چاہیے۔

کسی بھی ناول نگار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے موضوع اور نظریے کو حقیقت سے ملا کر اتنی چابکدستی اور مہارت سے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرے تاکہ قاری کسی قسم کا جبر محسوس نہ کرے۔ زندگی کی بصیرت عام زندگی کے قصے، کہانیوں، واقعات، حالات اور جزئیات سے ملتی ہے۔ اس

میں مذہبی، سیاسی، ثقافتی، معاشی نقطہ نظر بھی ہوتے ہیں اور سماجی ماحول بھی۔ ماضی اور حال دونوں دوبدو ہوتے ہیں اور مستقبل کے امکانات سر اٹھارہے ہوتے ہیں۔ ان سب کے جذبات کا احترام اور ترجمانی کرتے ہوئے ناول نگار زندگی کی بہتری کے لیے ایک نیا نکتہ پیش کرتا ہے۔ اس عمل میں کرداروں کی حرکات و سکنات، خواہشات، پس منظر اور نتائج معاون و مددگار ہوتے ہیں۔ کہانی کا ربط اور تسلسل اسی وقت آگے بڑھ سکتا ہے جب فکر اور نظریہ حیات میں ہم آہنگی پیدا ہو۔ نفسیاتی حوالوں سے کرداروں کی کشمکش، شکست وریخت اور داخلی ٹوٹ پھوٹ کی وجہ سے فلسفۂ حیات اجاگر ہوتا ہے۔ اس عمل میں ماحول کی موجودگی ضروری ہے۔ فلسفہ حیات کی بدولت ناول خالص ادبی دائرے میں شامل ہو جاتا ہے۔ ناول میں فلسفہ حیات ایک خاص حد تک پیش کیا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو قصہ سپاٹ اور کردار جھول کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مقصدِ حیات ہمارے آس پاس پھیلے ہوئے سماجی رابطوں، ٹوٹتے بنتے رشتوں اور معاشرتی پہلوؤں کو نئی جہتیں عطا کرتا ہے۔

عام ناولوں میں کوئی فلسفہ نہیں ہوتا پھر بھی واقعات کے سلسلہ وار بیان سے کچھ نہ کچھ اخلاقی معنی ضرور نکلتے ہیں۔ چاہے یہ معنی اچھے ہوں یا برے۔ ناولوں کا اثر ہمارے اخلاق اور کردار پر لازمی ہوتا ہے۔ ناول میں کردار کی خصوصیات کا تجزیہ، انسانی جذبات کا اتار چڑھاؤ اور باہمی تعلقات کی پیچیدگیاں اس طرح بیان ہوتی ہیں کہ قاری کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچ جاتا ہے۔ ہر ناول نگار ایک مستقل نظریہ سامنے رکھ کر ناول نگاری کرے گا تو اس سے ناول میں خرابی آئے گی۔

ناول میں زندگی کا وہی پہلو پیش کیا جاتا ہے جو دلچسپ ہو یعنی اس میں شاعرانہ صداقت (poetic truth) سے سروکار ہوتا ہے۔ اگر ناول نگار کا فلسفہ شاعرانہ حقیقت کے مطابق ہے تو قابلِ تعریف ہے۔ آج کل کے ناول نگار اس قسم کی حقیقت نگاری پر تُل جاتے ہیں کہ ان کا ناول ادب سے ہٹ کر پولیس کی رپورٹ لگنے لگتا ہے۔ لیکن سچا ادیب ہمیشہ اس پہلو کو نظر انداز کرتا ہے اور صرف

دلچسپ جزئیات ہی بیان میں لاتا ہے۔ گوئٹے نے کہا ہے کہ " فنکار کا فن یہاں تک حقیقت پر مبنی ہونا چاہیے کہ اس کو ہر طرح حقیقی کہا جاسکے مگر اس کے ساتھ ہی اس حد تک خیال بھی ہونا چاہیے کہ اس کو بالکل حقیقی نہ کہا جاسکے۔" الغرض حقیقت اور رومان دونوں کو ملا کر شاعرانہ حقیقت پیدا ہوتی ہے جو ناول نگاری کی جان ہے ناول نگار کے فلسفے کو اخلاقی بلندی سے بھی جانا جاسکتا ہے۔ قریب قریب ہر بڑا ناول نگار مصلحِ اخلاق بھی ہوتا ہے۔ اس لئے اعلیٰ اخلاق کی تبلیغ دنیا کے تقریباً ہر ناول میں پائی جاتی ہے۔ ناول نگار کا کام زندگی کے نقشے پیش کرنا ہے اس لیے اسے زندگی کی اعلیٰ قدروں کو ہی اپنی تحریروں میں پیش کرنا چاہیے۔

ناول نگار خود کسی سماج و معاشرے کا حصہ ہوتا ہے لہٰذا زندگی کے متعلق اس کے اپنے کچھ اصول کچھ تجربے ہوتے ہیں جنہیں وہ تخلیق کے مقصد کے طور پر ناول میں پیش کرتا ہے۔ اس طرح حقیقت اور حالات کے ساتھ سماج و معاشرے میں جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ان تبدیلیوں سے بھی ناول نگار دوچار ہوتا ہے لہٰذا بدلتے ہوئے مزاج و ماحول کے ساتھ اس کے فکر و خیال میں بھی اہم تبدیلیاں ہوتی ہے جو اس کے نقطۂ نظر اور مقصدِ حیات پر اثرانداز ہوتی ہیں۔

ابتدائی دور کے ناولوں میں فلسفہ حیات سماجی، اصلاحی اور مذہبی تبلیغ تک ہی محدود تھا۔ پریم چند نے اسے اس محدود دائرے سے نکال کر ناول کے موضوعات کو مزید وسعت دی اور آزادی اور انقلاب کے تصورات کو ناولوں میں پیش کیا۔

ماہرینِ ادب نے ناول میں فلسفۂ حیات کو پیش کرنے کے دو طریقے بتائے ہیں پہلے طریقے میں ناول نگار خود جگہ جگہ کرداروں کے حرکت و عمل کی فصاحت، وضاحت اور تشریح کرتے ہوئے اپنے خیالات کو پیش کرتا چلا جاتا ہے جس میں ناول نگار کی شخصیت کا ہی ظہور ہوتا ہے۔ دوسرے طریقے میں

ناول نگار واقعات و حادثات کو پلاٹ کی ترتیب اور کرداروں کی روشنی میں اس طرح بیان کرتا ہے کہ ڈرامائی انداز میں فلسفۂ حیات مکمل تاثیر کے ساتھ اپنے مقصد کو پالیتا ہے۔

بقول سید محمد عقیل رضوی:

"یہی وہ فن ہے جو ناول نگار کے نقطہ نظر اس کے تجربات یا ناپسندیدگی کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ علی الخلوص جب ناول نگار اپنے دور کے انسانوں کا جذباتی اور سماجی گراف پیش کرتا ہے اور تمام چھوٹی بڑی ہونے والی تبدیلیوں کا کیسا اور کتنا نبض شناس ہے۔ سب کچھ ناول نگار کے فن کی اظہاریت واضح کرتی ہے" (18)

2۔راجستھانی تہذیب میں ناول کی روایت:

یوں تو ادب کی ہر صنف میں کسی نہ کسی تہذیب کے رنگارنگ عکس دیکھے جا سکتے ہیں مگر ناول کا پھیلا ہوا دامن اپنے اندر جتنے جلوے سمیٹ لیتا ہے اس کا امکان کسی اور صنف میں نہیں۔ پھر ایک ایسی زبان کے ناول جو ملک کے کسی ایک خطے میں محدود نہ ہو بلکہ ہر علاقے میں پہنچ کر وہیں کی ہو رہی ہو اور آزادانہ طور پر پھلنے پھولنے لگی ہو اس کی وسعتوں کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔اردو کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنے علاقے میں قدم رکھنے کے ساتھ ساتھ ملک کے دوسرے خطوں میں کچھ اس طرح اپنالی گئی ہے کہ وہاں کے رہنے والوں کی نگارشات میں ان کی سرزمینوں کی دلکشی سماتی چلی گئی ہے۔اردو ناول میں علاقائی تہذیبوں کی جلوہ گری دیکھیں تو ان کی روشنی سے عجیب و غریب سماں نظر آئے گا۔

ناول کے ابتدائی دور میں ڈپٹی نذیر احمد کی دلی اور سرشار اور لکھنؤ کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ملیں گی۔ پھر یہی ناول پریم چند کے ساتھ بھرے پرے بارونق شہروں سے دور، دیہاتوں کے ٹوٹے

پھوٹے جھونپڑوں، کرشن چندر کے ساتھ کشمیر کی وادیوں، بمبئی کی چالوں، راجستھان کے ریگزاروں، راجندر سنگھ بیدی کے ساتھ پنجاب کے کھلیانوں کے درمیان لہلہاتا ہوا ملے گا۔ قراۃالعین حیدر کے ہاں بیک وقت کئی خطوں کی تہذیبوں کا حسن نظر آئے گا۔ اس طرح اردو ناول گزشتہ ایک صدی کے اندر، خصوصاً آج کے دور میں تہذیب کی مختلف سطحوں، پرتوں اور جہتوں کے راز افشا کر کے نہ صرف ہمیں مسرت عطا کرتا رہا بلکہ ہمارے ادراک اور ہمارے احساس پر بھی اثر انداز ہوتا رہا ہے۔

جب ہم علاقائی تہذیب کا ذکر کرتے ہیں تو لازماً ہمارا ذہن پہلے ان علاقائی روایات کی طرف جاتا ہے جو کسی خطے کے بسنے والوں کو انفرادیت بخش کر انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ یہ خصوصیات مقامات اور مناظر کے علاوہ کرداروں کے واسطے سے بھی اجاگر ہوتی ہیں۔ کرداروں کی زبان ان کے باہمی رشتے ناتے، مجلسی آداب، رکھ رکھاؤ، تعصبات، توہمات اور عقائد، دوسرے علاقے کے لوگوں سے تعلقات سب مل کر ایسی فضا کا پتہ دیتے ہیں جن کے پیچھے صدیوں کا تاریخی ورثہ ہے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناول کا کینوس بالعموم اور اردو کا دامن بالخصوص ہمارے ناول نگاروں کی بدولت وسیع ہوتا رہا ہے۔

ہر علاقے کی تہذیب کے کئی روپ ہوتے ہیں۔ ایک ہی سرزمین پر بسنے والے امیر اور خوشحال طبقے کی زندگی متوسط اور مفلوک الحال لوگوں سے مختلف ہوتی ہے۔ پھر شہروں، دیہاتوں اور مختلف سماجی گروہوں اور پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک ہی سرزمین سے تعلق رکھتے ہوئے بھی کئی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اب دہلی کو ہی لے لیں یہاں پرانے شرفاء کے گھرانوں میں جائیں تو برتاؤ، رکھ رکھاؤ، محاورہ، لہجہ اور ہوگا۔ یہی تہذیب جب کسی ادب پارے میں جلوہ گر ہوں گی تو اس کا انحصار بہت زیادہ ناول نگار کے اپنے مذاق اور مزاج پر بھی ہوگا۔

ہندوستان اور پاکستان کے ہر خطے کی سرزمین کی بو باس ہمارے ناول کے قصوں، کرداروں، مکالموں اور مناظر میں بسی ہوئی ہے۔ داستانوں میں خواب وخیال کی سرزمینوں کی پیشکش سے شروع

ہونے والا ناول دہلی کی فصیلوں، حویلیوں اور لکھنؤ کی محل سرا سے ہوتی ہوئی یوپی اور پنجاب کے دیہاتوں، تھر، تھل، روہی اور راجستھان کے صحراؤں سے ہوتی ہوئی کراچی اور بمبئی کی چکاچوند تک پہنچ چکا ہے

راجستھان میں اردو ناول کا ارتقا:

ناول مغرب کے زیر اثر اردو ادب میں متعارف ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے مقبول ہوتا چلا گیا۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہمارے ہاں قصے کہانی کا رواج ہی نہیں تھا۔ ناول کی ملتی جلتی شکل میں داستان ہمارے ہاں موجود تھی۔ ان داستانوں میں تخیل کی پرواز حسن و عشق کی آویزش، کردار نگاری کے نمونے، تصادم کی فضا، اسلوب کی خوبصورتی سب کچھ موجود تھا لیکن داستان اور ناول میں فرق ہے ناول اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے جبکہ داستان تخیلاتی قصوں اور ماورائی کرداروں پر مشتمل تھی۔

ناول سے مذہبی عقیدوں کو سلجھایا گیا، وعظ و نصیحت کے دفتر کھولے گئے، سیاسی مسائل زیر بحث ہونے لگے، علمی مباحث بیان کیے گئے لیکن یہ سب ضمنی باتیں ہیں۔ ناول کا اولین مقصد تفریح ہی ہے۔ ناول زندگی کی تصویر بھی ہے اور تفسیر بھی۔ ناول میں زندگی کے تجربات و مشاہدات ایک مسلسل قصے کی صورت بیان کیے جاتے ہیں۔ ناول لکھنے کے لیے ذہنی پختگی اور رچے ہوئے شعور کی ضرورت ہے۔ قصہ گوئی آدمیت کی ابتداء سے ملتی ہے لیکن ناول مہذب انسانوں کی دین ہے۔

داستان اس عہد کا تقاضہ تھی جب لوگوں کے پاس فرصت اور فراغت تھی۔ ناول کا آغاز باقاعدہ طور پر اسپین سے ہوا جہاں چودھویں صدی میں ناول کے تجربے کیے جانے لگے تھے۔ انگلستان میں ناول سولہویں صدی عیسوی تک اپنی ابتدائی شکل میں تھا۔ انیسویں صدی تک جاتے جاتے انگریزی ناول نے جو بڑے ادیب پیدا کیے ان میں رچرڈ سن کا نام قابل ذکر ہے۔ مغرب میں انیسویں صدی کے کے شروع

سے ہی سے ناول تمام نشیب و فراز سے گزرتا ہوا '' تھامس ہارڈی '' تک پہنچا۔ جسے صرف انگریزی ادب کا ہی نہیں بلکہ عالمی سطح کا عظیم ترین ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے

اردو میں ناول نگاری کا باقاعدہ آغاز مولوی نذیر احمد کے ناولوں سے ہوتا ہے پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولوی عبدالحلیم شرر، محمد علی طیب، منشی مرزا ہادی رسوا، راشدالخیری، منشی پریم چند، نیاز فتح پوری، کرشن چندر، عصمت چغتائی، سجاد ظہیر اور مرزا عظیم بیگ چغتائی نے ناول کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے اور بام عروج تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔

راجستھان میں اردو ناول کا آغاز انیسویں صدی کی آخری دہائی میں ہوا۔ تحقیقی نقطہ نگاہ سے راجستھان کا قدیم ترین معلوم ناول ''تاثیرِ محبت'' قرار پایا جاتا ہے جس کے مصنف حسن الدین خاموش ہیں۔ یہ ناول 1980ء کے بعد منظر عام پر آیا۔ اس سے پہلے کسی ایسی تصانیف کا علم نہیں ہوتا جس پر لفظ ناول کا اطلاق کیا جا سکے۔

''تاثیرِ محبت'' میں روایتی قصہ یا کہانی کے برعکس ایک ایسے خاندان کی داستان بیان کی گئی ہے جس کے افراد ہمارے معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس ناول میں نشیب و فراز کا دور اسی طرح آتا ہے جیسے ہماری زندگی میں اس کے تخلیق کردہ تمام کردار معاشرے کے اصل کردار معلوم ہوتے ہیں۔

'' تفسیرِ محبت '' کے تقریباً دس برس بعد راجستھان میں محمد عبدالقدوس فرحت کے ناول منظر عام پر آئے۔ ان میں سے ایک کا نام '' شامِ غم '' اور دوسرے کا '' زیب النساء بیگم '' تھا۔ '' شامِ غم '' کے متعلق قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ 1910،11ء میں شائع ہوا ہو گا کہ ان کا دوسرا ناول 1912ء میں منظر عام پر آیا۔ '' شامِ غم '' کے مصنف محمد عبدالقدوس فرحت کا تعلق ٹونک سے تھا۔ وہ صاحبزادہ محمد آیت اللہ خان بہادر امیر جنگ کے بیٹے تھے۔ مذکورہ ناولوں سے پہلے وہ تعلیمِ نسواں کے موضوع پر '' شمعِ ہدایت '' اور '' مستعار '' کے نام سے دو رسالے نکال چکے تھے۔ اپنے دور کے ناولوں کا مطالعہ کرتے ہوئے انہیں یہ

خیال آیا کہ وہ بھی قومی فلاح کے لیے اصلاحی نقطۂ نظر سے ناول لکھ سکتے ہیں۔ چناچہ انہوں نے "شامِ غم "اور "زیب النساء بیگم " کے عنوان سے دو ناول لکھ دیئے۔ "زیب النساء "تاریخی نوعیت کا ناول ہے۔ زیب النساء بیگم بادشاہ اورنگ زیب کی بیٹی کا نام تھا۔ فرحت القدوس نے اسے خیالی افسانوں سے قطعی معتبر اور صحیح واقعات کا مرقع کہا ہے۔

1912ء میں ٹونک کے منشی گوردیال سنگھ کائستھ نے بھی ایک ناول "مست سندھو" کے نام سے لکھا۔ اس میں اردو کے ساتھ ہندی الفاظ کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں۔ اس کے تقریباً پندرہ برس بعد راجستھان میں حفیظ اکبر آبادی کی متعدد ایسی تصنیفات ملتی ہے جنہیں ناول کہا گیا ہے۔ مثلاً "نافرمان بیٹا"، "فقیری جال"، "فانوس"، "خیال"، "نامراد عاشق"، "مشکوک پولیس"، "نربدا کا سفر" اور "نمونہ عبرت۔ "مذکورہ بالا تصانیف 1923ء سے 1928ء کے دوران منظرِ عام پر آئیں۔

حفیظ اکبر آبادی کے سبھی ناولوں میں سے "نربدا کا سفر" کو سب سے بہتر ناول ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس ناول میں انہوں نے سماجی مسائل پیش کرنے کے ساتھ ساتھ زبان وبیان منظر نگاری اور کرداروں کی بصیرت کو پیش کیا ہے۔ ناولوں میں بیک وقت خیر اور شر دونوں قوتوں کا اجتماع موجود ہے۔

"نربدا کا سفر" پھول کنور نامی ایک ایسی دوشیزہ کی سرگزشت ہے جسے قدرت نے نوجوانی میں ہی بیوگی کا لباس پہنا دیا۔ وہ اپنے وطن اجمیر سے ایک مذہبی زیارت کے لیے اپنے ملازم پریم چند کے ہمراہ نکلتی ہے۔ ریل کے سفر کے دوران وہ دو افراد سے ملتی ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ان میں سے ایک آنندی لال ہے اور ایک کنہیا لال۔ ناول میں ان دونوں کی کشمکش دکھائی گئی ہے۔ ناول کے آخر میں پھول کنور، کنہیا لال سے شادی کر لیتی ہے۔

حفیظ کا ایک دوسرا ناول "فقیری جال" فقیروں اور سادھوں کے مکر و فریب کا ترجمان ہے۔ حفیظ کے تقریباً سبھی ناولوں کے پس منظر میں حسن و عشق کے معاملات ضرور ملتے ہیں جس میں رومانی فضا

کا احساس ہوتا ہے۔ عشقیہ قصوں سے دلچسپی بھی ہر دور میں عام اور مقبول تر رہی ہے۔ اسی لئے حفیظ نے شعوری طور پر پلاٹ کو عوام و خاص کے مزاج کے مطابق ڈھالا ہے۔ حسن الدین خاموش، محمد عبدالقدوس فرحت، منشی گوردیال سنگھ، اور حفیظ اکبر آبادی وغیرہ نے اپنے ناولوں کو مسائل کی نشاندہی اور مفید خیالات کی اشاعت کا ذریعہ بنایا۔ راجستھان میں یکتا جودھ پوری اس حیثیت سے معروف ہیں کہ انہوں نے تذکرۂ شعرائے جے پور کی طرز پر تذکرۂ بہار سخن مرتب کر کے شائع کیا۔ یہ ان کا ادبی کارنامہ ہے۔ انہوں نے افسانہ اور ناول سے بھی راجستھان کی افسانوی نثر کے ذخیرے میں اضافہ کیا۔ انہوں نے 1932ء میں "فاتح سندھ" کے نام سے ایک ناول لکھا۔ "فاتح سندھ" ایک تاریخی ناول ہے۔ اس کے تمام کردار تاریخی ہیں لیکن جن واقعات سے ناول کا پلاٹ تیار کیا گیا ہے وہ اس شکل میں تاریخ میں نہیں ملتے۔ یکتا کا "فاتح سندھ" تاریخی ناول کے اعتبار سے سچائی سے انحراف کے باوجود کامیاب ہے۔ اس کے مختصر فقرے اور ان کی حمایت کے علاوہ مختلف مناظر کے بیان میں ان کا قلم محتاط رویہ اپنائے ہوئے ہے۔

یکتا کے معاصرین میں ایک اہم نام "قیسی رامپوری" ہے جو کہ آزادی کے بعد ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور یہیں وفات پائی۔ قیسی کا خاندان کب راجستھان آیا اس کا سراغ نہیں ملتا۔ قیسی کی ولادت رام پور کی اور تعلیم و تربیت اجمیر کی ہے۔ اجمیر کے قیام اور یہاں کی ادبی محافل میں اپنی انفرادیت اور شناخت کو قائم رکھنے کی خاطر خلیل الزماں قیس نے اپنا انتساب رام پور کی طرف رکھا کیونکہ اجمیر سے پہلے رام پور کی ادبی اور علمی محفلوں کی اپنی ایک تاریخ تھی۔ جو سکہ رائج الوقت تھی اور اس کا ایک زمانہ معترف تھا۔ قیسی رام پوری کا اصل میدان ناول نگاری اور افسانہ نگاری تھا۔ ان کے معلوم ناولوں کی تعداد 21 سے زیادہ ہے۔ خیال ہے کہ وہ 1960ء تک ناول لکھتے رہے۔ راجستھان میں سب سے زیادہ ناول لکھنے والوں میں سرفہرست قیسی رام پوری ہی ہیں۔

"آخری فیصلہ"،" دل کی آواز"، "حور"، "رضوان"،" محبت"، "برہنہ"، "اپاہج"، "عقیدہ"، "شیریں"، "رونق"، "دھوپ"، "تسلیم"، "شیطان" وغیرہ ان کے مشہور ناول ہیں۔ ان میں سے "آخری فیصلہ"، "اپاہج" اور "رونق" بحث کا موضوع بھی بنے رہے۔

قیسی کے تمام ناول رومانوی اور عشقیہ ہیں۔ قیسی کے ناول طربیہ انجام کی بدولت بیسویں صدی کے نصف اول میں لکھے جانے والے سماجی ناولوں کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔ قیسی کے بزرگ معاصر مرزا عظیم بیگ چغتائی کا نام اس عہد کی ادبی دنیا میں درخشاں نظر آتا ہے۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی نے جودھ پور میں اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا اور آخری سانس تک جودھ پور رہے۔ عظیم بیگ نے اپنی مزاحیہ اور ظریفانہ نثر سے جودھ پور شہر کو اردو ادب کی تاریخ میں امر کر دیا۔ 1940ء کے لگ بھگ جودھ پور سے انہوں نے "جارحی" کے نام سے ایک مزاحیہ ادبی رسالہ بھی جاری کیا جس کے چند شمارے ہی نکلے تھے کہ ان کی موت ہو گئی۔

یوں تو اردو میں رتن ناتھ سرشار اور منشی سجاد حسین ظریفانہ پیرائے میں ناول لکھ کر اس صنف ادب کو نئے امکانات سے روشناس کرا چکے تھے لیکن سچ یہ ہے کہ جس شخص نے ظرافت اور مزاح سے بھرپور ناول لکھے وہ مرزا عظیم بیگ چغتائی تھے عظیم بیگ چغتائی نے یوں تو ایک درجن کے قریب ناول لکھے مگر ان کے درجہ ذیل ناولوں کو زیادہ شہرت ملی۔

"کولتار"، "شریر بیوی"، "ویمپائر خانم"، "جنت کا بھوت"، "تفویض"، "شہ زوری"، "قصرِ صحرا"، "کمزور"، "فل بوٹ"، اور "چمکی"۔

ان میں "چمکی"، "خانم"، "کمزور" اور "شریر بیوی" اپنے بے تکلف مکالموں، غیر معمولی قوت مشاہدہ اور اسلوب کی دلکشی کے سبب آج بھی اردو کے مزاحیہ ناولوں میں ممتاز ہیں۔ خانم کے متعلق تو یہ بات عام ہے کہ یہ کردار بیگ کا دیدہ شنیدہ تھا۔ انہوں نے اسے اپنے گرد چلتے پھرتے دیکھا اور محسوس کیا

ہے۔اس کی گفتگو اور طرزِ تکلم کو اپنے باطن میں محسوس کیا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ "خانم" دراصل ان کی منکوحہ تھی اسی وجہ سے وہ اتنا باریک مشاہدہ پیش کر سکے لیکن ان کی بہن عصمت چغتائی نے اس کے کردار کو اپنے خاندان کے کسی فرد کا کردار تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔

"خانم" کی طرح دوسرا مقبول نام "چمکی" کا ہے۔اس کردار کو بھی اسی طرح شہرت ملی جیسے خانم کو مگر خانم اور چمکی دو مختلف کردار ہیں۔ چمکی کے کردار میں مصنف میں اس بلا کی کشش اور دلفریبی بھر دی ہے کہ یہ ناول غیر فانی بن گیا ہے۔

عظیم بیگ کے ناولوں میں ماحول کی تہذیبی، سماجی، معاشرتی اور معاشی کیفیات، گھریلو زندگی، خاندانی حالات، باہمی تعلقات اور کرداروں کی نفسیات کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں جن کو مرزا عظیم بیگ نے اپنی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں اور اختراعی قوتوں سے پوری طرح اجاگر کیا ہے۔ عظیم بیگ کے کرداروں میں نفسیات کی عمدہ تصویریں نظر آتی ہیں اور واقعات کی صداقت کا احساس ہی نہیں بلکہ یقین ہوتا چلا جاتا ہے۔

صالح محمد نائب نے بھی ناول "دو دل دو بھرے" کے نام سے 1960ء میں ناول لکھا۔ اودے پور کی مشہور ناول نگار خاتون ثروت خان جو ایک گرلز کالج میں لیکچرار کے عہدے پر فائز ہیں انہوں نے 2005 میں "اندھیرا پگ" کے نام سے ایک عمدہ ناول لکھا۔ "اندھیرا پگ" ثروت خان کا پہلا ناول ہے۔ راجستھان کی علمی دنیا میں ثروت خان کا قلم ابھی بھی رواں دواں ہے۔ "اندھیرا پگ" ناول نئی نسل کی پیش کردہ خاتون ثروت خان کی طرف سے بہترین تحفہ ہے۔اس میں پیش کیے گئے افکار نئی پود کی ذہنی تعمیر میں سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔ماضی کو حال سے ملاتے اور مستقبل کو اجالتے ہیں۔

الفاظ کا تسلسل، مطالب کا عمق، افکار کی سچائی، اور اسلوب کا بانکپن "اندھیرا پگ" میں موجود ہے۔ ناول میں مقامی بولی کا عنصر نمایاں ہے۔ ناول کے اس تجزیہ سے اندازہ ہو گا کہ راجستھان میں ابتداً

اصلاحی اور تبلیغی نوعیت کے ناول لکھے گئے جن میں ناول کے فن اور تکنیک سے عدم واقفیت کی وجہ سے قصہ کی ترتیب یعنی پلاٹ، کردار سازی اور زبان و بیان کے نقص نمایاں ہیں لیکن بعد ازاں جو تاریخی، معاشرتی، سماجی اور مزاحیہ ناول لکھے گئے ان میں فنی نقائص کم سے کم ہوتے چلے گئے۔

ناول نگاروں نے اپنے ناولوں کی خوبیوں سے ناقدین کو متوجہ کیا۔ ناول کی راجستھانی تاریخ میں قیسی، اجمیری اور مرزا عظیم بیگ چمکتے ہوئے ستارے کے مانند ہیں۔ ان دونوں ناول نگاروں کے بغیر راجستھان کی ناول نگاری کی تاریخ ادھوری نظر آتی ہے۔

ناول اندھیرا پگ کا تنقیدی جائزہ:

اردو ادب کے فروغ میں جس طرح خواتین نے قلمی معاونت دی ہے اس سے کسی طور پر انکار ممکن نہیں۔ خصوصی طور میں اردو ناول کی ترقی اور ترویج خواتین کے کردار سے انکار ممکن نہیں ہے۔ خواتین ناول نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے جنہوں نے سماجی، معاشرتی، سیاسی، ہجرت، تقسیم، تہذیب و ثقافت اور مذہب کے موضوعات کو اپنی تحریروں میں جگہ دی ہے۔ زندگی کے رموز و نکات ناولوں میں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ انہیں خواتین ناول نگاروں میں ہندوستان سے ایک نام ثروت خان کا بھی ہے۔ ثروت خان کی ناول نگاری اردو ادب کی بقامیں معاون اور مددگار ہے۔

ایک نقاد کا قول ہے کہ "کسی ملک کے رہنے والوں کے تخیل کی پرواز کا اندازہ وہاں کی شاعری میں ہوتا ہے مگر اس کی تہذیب کی روح اس کے ناولوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔" یعنی زندگی، سماج اور نظام معاشرت کے ہر پہلو کی بحیثیت مجموعی بہترین عکاسی کرنے کی جیسی اور جتنی گنجائش ناول میں ہے وہ کسی اور صنف میں میسر نہیں اسی لئے انسان اور معاشرے کے مابین رشتوں ناتوں کی بدلتی ہوئی اقدار کی تلاش و جستجو میں ماہرین سب سے پہلے ناول کا انتخاب کرتے ہیں۔ اردو ناول نے ڈیڑھ صدی کا سفر طے کیا

ہے۔اس میں ہر گام پر معیشت، سیاست، معاشرت، تہذیب و ثقافت اور سماجی مسائل کی منظر کشی کو اس نے بنیادی رجحان کی حیثیت سے جگہ دی ہے۔

خاص طور پر آزادی کے بعد اردو ناولوں میں دیکھا جائے تو ان میں موضوع پر مواد اور اسلوب کی بو قلمانی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی مختلف علاقوں کی اقدار، روایات، تہذیب و مسائل کا تنوع نظر آتا ہے۔ کہیں ہندو مسلم مشترکہ تہذیب سانس لیتی محسوس ہوتی ہے تو کہیں جاگیر درانہ زوال کا نوحہ ملتا ہے۔ کہیں بہار، اتر پردیش اور پنجاب کے مسائل کو فکر کا موضوع بنایا گیا ہے تو کسی نے سقوطِ ڈھاکہ، سقوطِ حیدر آباد پہ لکھا ہے۔ کسی نے کراچی، ممبئ اور دہلی جیسے بڑے شہروں کی مشینی کی زندگی کی عکاسی کی ہے۔

"میرے بھی صنم خانے"، " بستی"، " دو گز زمین"، " شب گزیدہ"، " راجہ گدھ"، "بہاؤ"، "فائر ایریا"، "فرات"، "مکان"، "شہر میں سمندر"، "نیلی بار" جیسے ناولوں میں تہذیبوں اور اقدار کا تنوع اور مختلف علاقوں کی زندگی اور مسائل کو بعض طور پر جانچا جا سکتا ہے۔ ان ناولوں کا اپنے علاقوں سے گہرا تہذیبی رشتہ ہے اور ان میں سے ہر ناول ایک خاص نظامِ فکر اور طرزِ معاشرت کی نمائندگی کرتا ہے۔ گویا یہ ایک تاریخ ہے جو ان ناولوں میں آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کر دی گئی ہے۔

"اندھیرا پگ" ہندوستان کی دھرتی سے تعلق رکھنے والی ثروت خان جو شعبہ تدریس سے وابستہ ہیں انہوں نے 2005ء میں ایک ناول لکھا۔ یہ ناول اپنے معاصر ضخیم ناولوں کے مقابلے میں مختصر ہے اور صرف 155 صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے 13 مختصر حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ آج جب ضخامت اور طوالت کو معیار کی کسوٹی سمجھا جانے لگا ہے ثروت خان نے مختصر ناول لکھ کر فنکارانہ ایمانداری کا ثبوت دیا ہے۔ اگر وہ چاہتیں تو طویل مکالموں، ذیلی واقعات، لڑائی جھگڑوں اور علاقائی سیاست سے کام لے کر

اسے ضخیم کر سکتی تھیں مگر انہوں نے موضوع اور کردار نگاری پر توجہ مرکوز رکھی۔ یہی اختصار اس ناول کو پڑھنے کی طرف مہمیز کرتا ہے۔

ناول "اندھیرا پگ" راجستھان کے ایک گاؤں "دیش نوک" سے متعلق ہے۔ اس کا موضوع بیوہ عورت کی زندگی ہے۔ اسے خاص راجستھانی پس منظر میں بنایا گیا ہے۔ یہی پس منظر اسے اہم بناتا ہے۔ راجستھانی تہذیب، کلچر اور نظام کو اس ناول میں برتا گیا ہے۔ راجستھانی کلچر کے جو حقائق اس ناول میں پیش کیے گئے ہیں وہ اسے معتبر اور منفرد بناتے ہیں۔ "دیش نوک" ایک ایسا پسماندہ گاؤں ہے جہاں خوش حالی اور ترقی کا نام و نشان نہیں۔ ڈھونڈنے سے بھی میٹرک پاس لڑکا نہیں ملتا۔ تعلیمِ نسواں کا تو سوال ہی نہیں۔ پروہتوں *[3] نے اپنے وراثتی علم یعنی تنتر منتر کریا کرم کانڈئو کو فروغ دے رکھا ہے۔ جو نسل در نسل چلا رہا ہے۔ نچلا طبقہ مزدوری کرتا ہے اور پنڈت ان کا استحصال۔ عورتیں ان پڑھ ہیں۔ پرائمری سکول برائے نام، ڈسپنسری میں ناکافی سہولیات، لوگ جادو ٹونہ اور جھاڑ پھونک پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں جس کے نتیجے میں زیادہ تر مرض بگڑ کر اموات کا سبب بنتے ہیں۔

راجستھان دارالحکومت دہلی کے قریب ہے اس لیے اکیسویں صدی میں راجستھانی عورت کی یہ بپتا پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک طرف عورت آسمان کی بلندیوں کو چھو رہی ہے تو دوسری طرف اسے اپنی مرضی سے جینے کا حق تک نہیں ہے۔ سماج نے ایسا نظام ترتیب کر رکھا ہے کہ مذہبی اور سماجی جکڑ بندیوں کے نام پر یہ غلاموں سے بھی بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ "دیش نوک" گاؤں میں پنڈتوں کی حویلی اس قصے کو جنم دیتی ہے۔ ثروت خان نے اس ناول کو راجستھان کے کلچر کو سامنے رکھ کر لکھا ہے اور سارے مناظر علاقائی نقطہ نگاہ سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ محمد نصیر احمد کہتے ہیں:

3۔ پروہت *: خاندان کا گروہ یا پنڈت جو اس خاندان کی مذہبی رسمیں ادا کرتا ہے۔ مذہبی پیشوا

"ثروت خان اس بات سے آگاہ ہیں کہ "علاقائیت ہی آفاقیت کا درجہ حاصل کرتی ہے" لہذا یہ کہا جائے گا کہ ناول "اندھیرا پگ" بڑا کینوس رکھتا ہے جس میں راجستھان کی پوری ثقافت، رہن سہن، طور طریقے، فرسودہ نظام، دوہرا کردار اور عورتوں کی محرومی کھل کر سامنے آئے ہیں۔"(19)

ثروت خان نے راجستھانی عورت کا المیہ اس ناول میں پیش کیا ہے۔ یہ ناول جامع اور دل سوز ہے۔اس ناول میں راجستھان کے حوالے سے پہلی بار مصنفہ نے بیوہ کے مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ مصنفہ نے اس طرف توجہ مبذول کرائی ہے کہ آج گلوبلائزیشن globalization کے دور میں بھی راجستھان کی عورت سماجی طور پر کئی مسائل کا شکار ہے۔ اس کی بہت سی بنیادی خواہشات بھی سماجی پابندیوں کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔

ناول کا مرکزی کردار "روپی" ہے جو تعلیم حاصل کرنے کی خواہاں ہے لیکن اس کی مخالفت گاؤں میں بسنے والا ہر فرد کرتا ہے۔ "اندھیرا پگ" ایک ایسا ناول ہے جس میں مصنف نے گھٹ گھٹ کر زندگی جینے والی عورتوں کی نمائندگی کی ہے اور ایسی فرسودہ رسموں کے خلاف احتجاج کیا ہے جس میں عورتوں کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔ اس ناول میں ثروت خان نے راجستھان میں عورتوں کی زندگی کے تلخ حقائق کو بیان کیا ہے۔

ممتاز نقاد پروفیسر وارث علوی "اندھیرا پگ" کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اندھیرا پگ" ثروت خان کا پہلا ناول ہے اور اس قدر کامیاب کہ ان کی تخلیقی صلاحیت منواتی ہے جس میں بیوہ کی بپتا تانیثی بغاوت میں بدل جاتی ہے۔ بیوی کی بپتا کے بیان میں راجستھان کے پروہتوں کی حویلیوں

کا نقشہ نازیوں کے کیمپوں کی یاد دلاتا ہے اس فرق کے ساتھ کہ نازیوں کا ظلم دشمنوں کا تھا اور نفرت کے جذبے کے تحت تھا جبکہ بیوہ بیٹی پر ظلم اپنوں کا تھا اور سماجی مجبوری اور رسم و رواج کی غلامانہ پابندی کے سبب تھا۔ اس ناول کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ظلم، بپتا اور دکھ اتفاقی ہیں"
(20)

گو ناول کا قصہ مختصر ہے اس پر محض ایک افسانہ بھی لکھا جا سکتا تھا لیکن ناول کا اصل جوہر اس کے چھوٹے بڑے کردار، اس کی جزئیات نگاری اور اس میں بیان کی گئی تہذیب اور نظام ہے۔ یہ کردار دیش نوک جیسے دیہاتوں میں ہی مل سکتے ہیں۔ روپی، اس کی پھوپھی، راج کمار، سبھدار، ٹھاکر رتن سنگھ، راجکمار، رمیا، دادی اور رونی دھونی اس کے اہم کردار ہیں۔ ناول راجستھانی بیوہ کی بپتا بیان کرتا ہے۔ شوہر آج بھی مرے ہیں اور عورتیں بیوہ ہوتی ہیں۔

ان کی کہانی بھی لکھی جاتی ہے لیکن ثروت خان نے ایسا اسلوب اپنایا ہے جو اپنا الگ رنگ رکھتا ہے اور حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ نازک اور لطیف جذبات کا بھی بیانیہ ہے۔ ثروت خان نے اپنے پہلے ناول سے ہی ہم عصر اردو ناول نگاروں میں اپنی پوزیشن مستحکم کرلی ہے مگر اس کا موضوع اور پس منظر باقی ناولوں کے مقابلے میں مختلف ہے۔ ناول میں بیان کی گئی تہذیب، پس منظر اور جو حقائق بیان کئے گئے ہیں وہ اسے اہم بناتے ہیں۔

3۔ "اندھیرا پگ" کا کرداری مطالعہ:

ناول میں مختلف قسم کے کردار ہیں۔ ہر کردار کے دامن میں کھونے، لٹ جانے، مرنے، مٹنے کی ان گنت داستانیں ہیں۔ ہر کردار کا جگر چھلنی، ہر چہرہ الجھا ہوا، خون آشام اقدار سب مل کر ہمیں راجستھان کے کلچر کے ان گنت زمینی حقائق سے روشناس کراتے ہیں۔ پورا ناول جذباتی اور ذہنی بھٹی میں

کھول رہا ہے۔ قاری ناول کی قراءت کے دوران قدم قدم پر جیتا مرتا ہے۔ بے چینی، اضطراب، خواب، حقیقت کا سا گماں، آسمان میں اڑنے کی چاہت اور پنجرے میں قید ہونے کی مجبوری ہی اس ناول کا اصل کرب ہے۔ مصنفہ ایک ماہر فوٹو گرافر کی طرح فوٹو اتارتی چلی جاتی ہیں۔ اس تصویر کشی کے دوران وہ تمام واقعے، حادثے اور المیے پر خاموش احتجاج کرتی محسوس ہوتی ہیں۔ یہ احتجاج ہی "اندھیرا پگ" ناول کا مرکزی نقطہ ہے جو اس ناول کے لفظ لفظ میں سمویا گیا ہے۔

روپ کنور:

روپ کنور عرف روپی اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ نیئر شر تن سنگھ والد کا نام اور سبھدرا والدہ کا نام ہے۔ ذہین فطین روپی تعلیم کے علاوہ بہت سی خوبیوں کی مالک ہے۔ "دیش نوک" کی لڑکیوں پر رسم و رواج کے پہرے ہیں۔ وہاں لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ روپی کی پھوپھی اسے اعلیٰ تعلیم کے لئے شہر لے جانا چاہتی ہے لیکن راج کنور اور روپ کنور کی تمام تر سعی اور احتجاج کے باوجود ان کی خواہشوں کو رد کر دیا جاتا ہے۔ ان کے خواب اور تمنائیں اس معاشرے کے فرسودہ نظام کی بھینٹ چڑھا دیے جاتے ہیں۔ "اندھیرا پگ" میں صفحہ نمبر 13 پر دیکھئے:

> " بڑوں کو سنجیدہ گفتگو کی طرف مائل دیکھ کر روپی ٹرافی لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی، لیکن پھر کچھ سوچ کر پلٹی اور دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو کر کان لگا کر ان کی گفتگو سننے لگی۔ یہ باپ کی آواز تھی۔۔۔
> "ایسا کیسے ہو سکتا ہے راج، تم جانتی ہو ہم مجبور ہیں، بھلا اپنی برادری میں پہلے کبھی ایسا۔۔۔ بھئی سا! پھپھی نے بیچ میں ہی بات کاٹ دی۔
> "زمانے کی دھارا بہت تیز ہے، لڑکی کو پیروں...." ابھی ان کا جملہ ادھورا ہی تھا کہ روپی کے کانوں میں کرسی کے ہتھے پر مکہ مارنے کی

"دھم" سے آواز آئی۔ اس کے کانوں میں گرجدار آواز کے شول چبھنے
لگے۔ "بس ہم نے کہہ دیا... دو مہینے بعد روپ کنور کی شادی ہے"۔۔۔
روپی کا ذہن شائیں شائیں کرنے لگا"(21)

سپنوں کا اندھیرے میں روشنی کی طرح ابھرنا، خوابوں کا ہو بہو بیان ہونا اس ناول کے پہلے حصے کا دائرہ کار ہے۔ جب روپی کی تمناؤں کے نرم و نازک پر کتر دیئے جاتے ہیں اور صرف 17 سال کی عمر میں وہ سسرال روانہ کر دی جاتی ہے تو قاری جذباتی اور ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ آسمان میں پرواز کرنے کی خواہش اور پاتال میں دھنسنے کی اذیت روپی کے ساتھ ساتھ قاری کو بھی کرب میں مبتلا کرتی ہے۔ یہ کرب اس وقت انتہا کو پہنچ جاتا ہے جب شادی کے چند مہینوں بعد ہی روپی "بیوہ" ہو جاتی ہے۔ یہاں سے ناول کا اصل موڑ شروع ہوتا ہے۔ ناول کی مصنفہ ثروت خان قاری کو رسموں رواجوں اور فرسودہ بندھنوں میں جکڑے ہوئے اس نظام سے متعارف کراتی ہیں۔ جب قدرت کے فیصلے کو لوگ عورت کی نحوست سے تعبیر کرتے ہیں۔ نازوں کی پلی روپی حویلی کے تنگ و تاریک، سیلن زدہ، بدبودار، چاروں طرف سے بند کوٹھڑی میں سر منڈوا کر بدرنگ ساڑھی میں ملبوس ناگفتہ بہ زندگی گزارنے پر مجبور کر دی جاتی ہے تاکہ اس کی خواہشات زندہ نہ ہونے پائیں۔ پھوپھی، ماں، باپ، بھائی کوئی اسے نجات دینے کی طاقت نہیں رکھتا۔ پھوپھی اپنی بھتیجی کو لانے کے لئے سسرال جاتی ہے تو دیکھ کر دنگ رہ جاتی ہے کہ روپی ایک کال کوٹھڑی میں محبوس ہے پانی میں سوکھی روٹی ڈبو ڈبو کر کھاتی ہے۔ ڈیڑھ روپے کی ٹائر کی چپل پہنتی ہے اور سسک سسک کر جی رہی ہے۔ راج کنور لاکھ کوشش کرتی ہے کہ روپی کو اپنے ساتھ گھر لے جائے لیکن بیوہ کو اس کوٹھڑی سے نکالنے کے لیے بھی اماوس کی رات کا انتظار کرنا پڑتا ہے تاکہ بیوہ کا منحوس سایہ کسی جاندار پر نہ پڑ سکے۔ اماوس کی رات کے اس سفر کو " اندھیرا پگ" کا نام دیا گیا ہے.
راج۔ کنور جب روپ کنور کو ساتھ لے جانا چاہتی ہے تو ایک مکالمہ دیکھیں:

> "یہ اس کوٹھڑی میں رہے گی، بھلا یہ کس کھیت کی مولی ہے۔۔۔ صدیوں سے ہمارے پرکھے یہ سب کرتے چلے آرہے ہیں پھر اس پر ان کے ساتھ ہم بھی تو اپنے کرموں کو بھوگ رہے ہیں۔ آج پورے بارہ دن ہو گئے ہیں۔۔۔ آتے ہی ڈائن دو ہی مہینے میں میرے بیٹے کو کھا گئی اور کھانے کو کیا بچا ہے ابھاگن سے کہا تھا ستی ہو جا۔ نشہ کر کے بیٹھ جاتی چتا میں۔۔۔ پتہ بھی نہیں چلتا۔ ایک ہی بار میں پاپ سے چھوٹ جاتی، سیدھے سورگ ملتا۔۔ نہیں مانی، ہٹ دھرمی۔ اب تل تل کر مرتی رہے سارا جیون"
> (22)

"اندھیرا پگ" کی رسم ڈیڑھ ماہ کے بعد ادا ہوتی ہے اور روپی میکے آجاتی ہے مگر المیہ اس وقت ایک نیا رخ اختیار کرتا ہے جب اس کی مشکلات پر آنسوں بہانے والا اپنا خاندان بھی اسے ویسی ہی زندگی جینے پر مجبور کرتا ہے جیسی وہ اپنے سسرال میں جی رہی تھی کیونکہ رسم ورواج اقدار وروایات اور فرسودہ نظام تو وہی ہے۔ ہندوستانی تہذیب کی دہائی دیتا یہ نظام صدیوں سے رائج ہے اور اسے کوئی بدلنا چاہے تو بچہ بچہ اس کا مخالف بن جاتا ہے۔ نازوں کی پلی روپی کو جب گھر کی ملازمہ رونی اس حالت میں دیکھتی ہے تو کہتی ہے بھگوان کسی کو ودھوانہ کرے یوں روز روز مرنے سے تو اچھا ہے کہ ودھوا ستی ہو جائے تو ایک بار میں پاپ کٹے۔

کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی روپی کی حالت دیکھ کر اس کی پھوپھی ایک بار پھر گھر والوں سے لڑتی ہے اور اس کے علاج کے بہانے شہر لے جا کر تعلیم جاری رکھنے کا کہتی ہے۔ روپی چونکہ ذہین تھی جلد ہی میڈیکل ٹیسٹ میں کامیاب ہو کر ڈاکٹری پڑھنے لگتی ہے مگر بدقسمتی یہاں ابھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ گاؤں والوں کو خبر ملتی ہے تو پورا "دیش نوک" اس کے خلاف اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اسے مجبور کر دیا جاتا ہے کہ روپی واپس گاؤں آئے۔ جس گاؤں کی ترقی اور بہتری کے لئے وہ پڑھ رہی تھی وہی لوگ اسے پھر

بند کوٹھری میں قید کر دیتے ہیں لیکن اب روپی پہلے والی روپی نہیں ہے اسے جب اپنے باپ کے ظلم اور کالے کرتوتوں کا علم ہوتا ہے تو نہ صرف یہ کہ وہ بغاوت کرتی ہے بلکہ پولیس کو بلا کر ان سب کو گرفتار کرا دیتی ہے۔ روپ کنور بڑی بے باکی سے اپنے والد سے کہتی ہے:

"میں پوچھتی ہوں باپو آخر کب تک ہم اس سسٹم کی بھینٹ چڑھتی رہیں گی۔ یہ تو کمیونسٹوں سے بھی بد تر ہے، ذہن، مشن، ویژن سب کا ناش کرنے والا۔۔۔ میں ہاڑ ماس کا لو تھڑا نہیں بننا چاہتی۔ مجھے ادھیکار چاہیے۔ آپ نے شاستر پڑھے ہیں کیا آپ نہیں جانتے، سماج نہیں چاہتا کہ خود شاستروں کی رچنا استری نے کی ہے پھر ہماری ماتا بھی تو استری ہی تھی۔ باپو میں استری کی اسے کھوئی ہوئی اس استھتی کی تلاش میں ہوں۔ آپ لوگ کب تک ان جھوٹی مریادوں میں پڑے رہیں گے "
(23)

روپی بیوہ ہونے کے بعد جب اپنی زندگی میں آئی تبدیلی کو دیکھتی ہے تو چکرا کر رہ جاتی ہے۔ اسے سمجھ نہیں آتا کہ اس سارے معاملے میں اس کا کیا قصور ہے۔ وہ جانوروں سے بھی بد تر سلوک کی مستحق کیوں ٹھہرائی جا رہی ہے۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے سوال اٹھتے ہیں تب وہ گھبرا کر اپنی ماں سبھدرا رانی سے استفسار کرتی ہے:

"ماں کیا جیون کیول بیاہ تک سمپت ہے؟ ماں کیا جیون کا کوئی اور ادیشیہ نہیں؟ ماں کیا استری اپ بھوگ کی دستو ماتر ہے؟ ماں ہماری پرامپرا بلیدان ہی کیوں مانگا کرتی ہے؟ اچھائیں دبانے کے لیے کیوں بنائی جاتی ہیں؟ ماں کیا تم نے سوچا ہے دبائی ہوئی اچھاؤں کے برے پرنیام پوری منشیہ جاتی کو بھگتنے پڑتے ہیں"(24)

"اندھیرا پگ" میں روپی ایک مظلوم مگر مضبوط کردار ہے جو زندگی کی جدوجہد میں اپنے ایقان، صداقت، موت سے بے خوف ہو کر استقامت سے اپنی راہ خود بناتا ہے۔ اردو ناولوں میں کسی بھی نسوانی کردار کو اتنا مضبوط اور استقلال کے رنگ میں رنگ کر کم پیش کیا گیا ہے۔ اس احتجاج اور حالات سے لڑنے کی جرات مندانہ کوشش اس کردار کو نمایاں بنا دیتی ہے۔

> "اس نے ماں پر حقارت سے نظر ڈالی اور فولادی عزم کے ساتھ کانپتی ہوئی دھونی کا ہاتھ پکڑا اور اپنی کوٹھڑی کی جانب طوفانی انداز سے بڑھ گئی۔ وہاں جا کر اپنی کتابوں کا بنڈل باندھا اور پھر حیران و پریشان کھڑی دھونی کا ہاتھ دوبارہ پکڑ کر حویلی کے پھاٹک کو لانگھ گئی۔ آج اماوَسیہ کی اندھیری رات نہیں تھی بلکہ پورنما کا چمکتا چاند اپنی مکمل آب و تاب کے ساتھ دمک رہا تھا سروں نے تاروں نے فضا میں خماری پیدا کر دی تھی۔ روپ کنور ان چاند ستاروں کی رہنمائی میں اجیارے کے پگ کی طرف بڑھتی چلی جارہی تھی"(25)

روپ کنور عرف روپی کا کردار مسلسل جدوجہد، اپنے حقوق کے لئے لڑنے اور بالآخر ان تھک محنت اور قربانی کے بعد اپنی منزل حاصل کرنے والی عورت کا کردار ہے۔ فرسودہ روایات اور اندھے نظام سے مقابلہ کرنے اور اسے بدلنے کے لیے معاشرے کو ایسے ہی کرداروں کی اشد ضرورت ہے۔

راج کنور:

ناول اندھیرا پگ کا دوسرا مضبوط نسوانی کردار راج کنور کا ہے جو ٹھاکر رتن سنگھ کی بہن اور قصے کی مرکزی کردار روپ کنور عرف روپی کی پھوپھی ہے۔ راج کنور باشعور عورت ہے جو شہر میں رہتی ہے اسی وجہ سے دنیا کی ترقی اور آگے بڑھنے کے مواقع سے بخوبی واقف ہے۔ راج کنور کا شوہر اور بچے اسے پیار

کرتے ہیں اور اس کے ہر فیصلے میں ساتھ دیتے ہیں۔ راج کنور اپنی بھتیجی سے بہت پیار کرتی ہے اور اس کے دکھوں سے اتنی پریشان ہوتی ہے کہ دل کو روگ لگا بیٹھتی ہے۔ بھتیجی کی کامیابی پر راج کنور کا اپنے بھائی سے بات کرنے کا انداز ملاحظہ کریں:

> "بھائی جی۔۔۔ ہم روپ کنور کی ہی بات کر رہے تھے۔ بڑی ہوشیار بچی ہے، ہم تو کچھ نہیں بن پائے چاہتے ہیں کہ اسے قصبے سے نکال کر شہر لے جائیں اونچی شکشا دلوائیں۔ یہ ضرور ہمارے خاندان کا نام روشن کرے گی۔"(26)

راج کنور روپی میں اپنی پرچھائیاں دیکھتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ روپ کنور اعلیٰ تعلیم حاصل کرے اس کے لیے وہ ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ باب 2 میں دیکھیں:

> "راج کنور بھتیجی کے لئے بہت کچھ کرنا چاہتی تھی لیکن بھائی کی مجبوری اور خاندانی دباؤ کی وجہ سے وہ ایک بار پھر پست ہو گئی تھیں"(27)

روپی کی صرف 17 سال کی عمر میں شادی اور پھر دو تین ماہ میں ہی بیوہ ہونے کے بعد جب اس پر زندگی تنگ کر دی جاتی ہے تو راج کنور ہی اسے واپس لانے کے لئے پرتاب پور جاتی ہے جہاں روپی اندھیری کوٹھڑی میں محبوس ہے۔

> "راج کنور کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ "آج بھی یہ ظلم اور وہ بھی نازوں کی پلی روپی پر" اب سمجھ میں آیا۔۔۔ دستور کے مطابق گیارہ دن تک اسے یہی سوکھی روٹی پانی میں بھگو بھگو کر کھلائی ہو گی تبھی تو کیسی پیلی چمڑی نکل آئی" وہ تو دہل گئیں، آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً اوٹ سے باہر نکلیں، جھپٹا مار کر روپی کے ہاتھ سے پیالہ لے لیا اور دے مارا زمین پر"(28)

راج کنور شروع سے لے کر آخر تک قصے میں موجود رہتی ہے اور جہاں جہاں ضرورت پڑتی ہے روپی کی ہر ممکن مدد کرتی ہے۔ کسی بھی قسم کے نظام میں تبدیلی لانے کے لئے معاشرے میں ایسے مددگار اور موافقت آمیز کرداروں کا ہونا بے حد ضروری ہے۔

دادی:

ناول میں ایک اہم کردار دادی کا ہے۔ یہ بڑھیا اس فرسودہ نظام اور بگڑے ہوئے معاشرے میں پل بڑھ کر بوڑھی ہو گئی ہے۔ حویلی کی اندرونی اور بیرونی سرگرمیوں اور روایات کی امین ہے۔ یہ اپنی پوتی سے محبت کرتی ہے اس کی کامیابی سے خوش بھی ہوتی ہے لیکن چونکہ اس کے ذہن میں زندگی بھر عورت کا روایتی تصور رہا ہے اس لیے پوتی کی آزادی سے متعلق باتیں اسے ہضم نہیں ہوتیں۔ وہ سوچتی ہے کہ کیا کوئی بھی عورت اتنی خود مختار ہو سکتی ہے کہ اپنے بارے میں فیصلہ کر سکے۔ کیا بیوہ بھی اتنی خوش یا مسرور ہو سکتی ہے؟ جب دادی کو شہر سے روپی کی کامیابی اور خوشی کی خبر ملتی ہے تو بے اختیار سوچتی ہے:

> "کیا ودھوائیں بھی اتنا سکھ بھوگ سکتی ہیں۔ کیا انہیں نیا سنسار رچنے کا ادھیکار دیا جا سکتا ہے؟ نہیں کبھی نہیں! ہمارے زمانے میں تو۔۔۔۔!!!
> اور پھر وہ پلنگ پر دراز ہو آنکھیں بند کر لیتیں، کچھ دیر کروٹیں بدلتیں اور پھر ٹھنڈی پڑ جاتیں"(29)

دادی کا کردار علامتی طرز کا ہے۔ یہ اس نظام کی سختی، دوغلے پن، اور احمقانہ کے فکر و عمل میں تضاد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مثال کے طور پر روپی جب پرتاب پور میں اپنے سسرال کے گھر مجبور و محبوس ہے تو گھر کے سبھی افراد کے ساتھ ساتھ دادی بھی ریت رواج کے بندھنوں کو برا بھلا کہتی ہے۔

"عجیب ریت ہے اس اندھیرے پگ کی. کوئی میکے والا خیر خبر نہیں لے سکتا۔ ایک ایک دن نکالنا بھاری پڑ رہا ہے۔ نہ معلوم کیا بیتی ہو گی بچی پر اس ڈیڑھ ماہ میں" ایک طرف تھالی رکھ کر اپنے پلو سے آنسوؤں کو پونچھا، " تھالی اٹھالو۔ بہو کھالیا۔۔۔ جوان پوتی رانڈ ہو جائے تو بھلا بوڑھی ہڈیوں کو سوستھ رہنے کا کیا اندیشہ ہے"(30)

شادی کے اس دوہرے معیار کے حامل کردار کے بارے میں شہاب ظفر اعظمی رقمطراز ہیں:

"وہی روپی جب اندھیرا پگ رسم کے بعد گھر لوٹی تو دادی اس کا اپنی ماں کے ساتھ ایک رات سونا بھی گوارہ نہیں کرتی کیونکہ یہ صدیوں سے چلے آرہے رسم و رواج کے خلاف ہے۔ وہ روپی کو جھنجھوڑ کر اٹھا دیتی ہے۔" اٹھ روپی چل نکل یہاں سے اپنے ٹھکانے، تیری ماں تو پاگل ہوئی ہے" اور پھر روپی کی ماں سے کہتی" تم ہوتی کون ہوں سماج کے نئیم قائدے توڑنے والی۔ مامتا ہم بھی رکھتے ہیں پر یوں انرتھ نہیں کرتے۔ بیوہ کے ساتھ اتنی دیا ٹھیک نہیں۔ اسی طرح روپی کو تھوڑا تیز چلتے ہوئے دیکھتی ہے تو فورا" ٹوکتی ہے.۔" بھاگتی کیوں ہے روپی، بھاگنے سے حرکت بڑھ جاتی ہے۔ سانسیں اوپر نیچے ہونے لگتی ہیں۔ پھر اچھائیں جاگنے کا ڈر رہتا ہے۔"(31)

ناول میں دادی کے علاوہ روپ کنور کی والدہ سبھدرا، چاچی، سہیلی رمیا اور کھوسٹ بڑھیا کے کردار بھی ہے جو قصے کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرے کے مختلف رخوں اور رواجوں سے آشنائی بخشتے ہیں۔ ناول میں مرد کی صورت کوئی اتنا توانا کردار نہیں ہے۔ روپی کے والد ٹھاکر رتن سنگھ کا کردار نسبتاً زیادہ دیر تک سامنے رہتا ہے۔ سراپا دیکھیے:

"سفید کرتا، سفید کلف دار دھوتی، سنہری صرافہ، پاؤں میں سنہری زری دار جوتیاں اور گھنی مونچھوں کے ساتھ پیشانی پر عباسا تلک لگائے، لمبے چوڑے اجلے اجلے پنڈت رتن سنگھ "(32)

ایک باپ ہوتے ہوئے بھی روپی کے لئے وہ کچھ نہیں کر سکتے۔اس کی وجہ سے روپی کی شادی جلدی ہو جاتی ہے اور والد کی وجہ سے ہی روپی شہر سے ادھوری تعلیم کے ساتھ واپس لوٹنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ رتن سنگھ کا کردار معاشرے کے دوہرے پن کو ظاہر کرتا ہے اور ایک ایسے معاشرے کی نشاندہی کرتا ہے جہاں عورتوں اور مردوں کے لیے الگ الگ پیمانے مقرر ہیں۔ عورت کے جذبات نہ جاگ جائیں تو اسے جانوروں جیسی زندگی جینے پر مجبور کیا جاتا ہے تو دوسری جانب مرد اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے گھر کی ملازماؤں تک سے زیادتی کر سکتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ رونی جب حاملہ ہو جاتی ہے تو گھر کے سارے افرد مل کر اسے مار دیتے ہیں اور کسی کا ضمیر تک ملامت نہیں کرتا۔اسی طرح بے قصور بیوہ کو اصولوں کے نام پر کوٹھڑی میں محبوس کیا جاتا ہے۔ فکر و عمل کا یہی تضاد، استحصال، ظلم اور سفاکی کی مختلف داستان رقم کرتا ہے۔ ناول کا ایک کردار راجکمار ہے۔ یہ گاؤں کے غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ روپی چونکہ پنڈتوں کی عزت ہے لہٰذا یہ دور دور سے ہی روپ کنور پر فدا ہے۔ یہ ایک بزدل مجبور اور معاشرے کے قوانین میں جکڑا ہوا عاشق ہے جو کھلے بندوں اظہار سے ڈرتا ہے۔ بہادری اور بغاوت کا خواب اس کے لیے ممنوع ہے۔اس کے سامنے روپی کی شادی ہوتی ہے۔ وہ بیوہ ہوتی ہے۔ شہر چلی جاتی ہے۔اس کے دوست اسے ورغلاتے ہیں اور اظہار کی ترغیب دلاتے ہیں۔ راج کمار محبت کا اظہار نہیں کر پاتا۔ وہ روپی کے دکھ پر دکھی ہوتا ہے۔اس کے شہر جانے پر خوش ہوتا ہے مگر عملی طور پر روپی کی مدد کرنے کے لئے ایک قدم تک نہیں اٹھا پاتا۔ روپی جب اپنے باپ اور گھر والوں کے خلاف پولیس کو خط لکھتی ہے تو راج کمار کا ہی سہارا لیتی ہے۔ بہر حال راج کمار کا کردار اپنے اندر کوئی کشش نہیں رکھتا سوائے اس کے کہ وہ دل کا اچھا ہے۔

اسی لئے قصے کے آخر میں جب روپی گاؤں سے آزاد ہو کر شہر کی طرف قدم بڑھاتی ہے تو راج کمار بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑتا ہے۔ راج کمار کے دوستوں میں "رش رکھ" ہے جو ہندو مسلم مشترکہ کلچر کی خوبصورت مثال ہے. یہ بھی استحصال کا شکار ہے کیونکہ ایک بڑے گھر کی بیٹی سے اس نے پیار کیا جس کے نتیجے میں اسے دربدر کر دیا جاتا ہے۔ "روپیشور سنگھ" ہے جو ایک الگ قسم کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے اور وہاں کی غلیظ رسموں کی وجہ سے ایچ آئی وی میں مبتلا ہو کر زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔ یہ کہانی افراد کی نہیں بلکہ ایک معاشرے میں ایک تہذیب کی کہانی ہے۔ اس تہذیب کے مظاہر پر مصنفہ کی گرفت مضبوط ہے چنانچہ راجستھانی تہذیب و ثقافت سے متعلق بلیغ اشارے، استعارے اور تفصیلات کا بیان اس ناول میں بہت سلیقے سے کیا گیا ہے۔ ناول کی تکنیک، اپنے کرداروں کی تفصیلی جانکاری، اور ان کی زبان اور محاوروں سے ایسی آشنائی اور کرداروں اور ان کے ماحول کی اتنی پر اثر عکاسی تخلیق کار کے پہلے فن پارے میں مشکل سے ہی ملتی ہے۔

ہندوستانی معاشرے میں عورتوں کا استحصال ایک کڑوا سچ ہے۔ آئے دن اخبارات اور میڈیا کی زینت بننے کے ساتھ ساتھ فکشن میں بھی اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس موضوع کو متاثر کن انداز میں لکھنا مشکل ہے۔ باقی ناول نگاروں نے عورت اور اس کے مسائل کو اپنے اپنے طور پر اپنی تخلیقات میں برتا ہے لیکن ثروت خان نے موضوع کی بُنت سے ایک بھرپور تہذیبی معاشرہ خلق کر کے انفرادیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ناول راجستھانی پروہتوں اور پنڈتوں کی سماجی زندگی اور مذہب و کلچر کی آڑ میں جاری خواتین کے استحصال اور جبر کی کہانی ہے۔ دوسری طرف یہ ناول عورت کے احتجاج بغاوت اور ظلم سے نجات کی راہ تلاش کرنے سے بھی عبارت ہے۔ ثروت خان نے عورتوں کے ساتھ ہونے والی نا انصافی اور صنفی امتیاز کو دلچسپ کینوس اور منفرد زاویے سے پیش کیا ہے۔ ثروت خان نے موضوع پرانا ہونے کے باوجود منفرد اندازِ بیان اور لفظیات کا تجربہ کر کے ناول کے مطالعے کے امکانات پیدا کیے ہیں۔

حوالہ جات

1- محمد حسن عسکری ،"ادبی تجربے (مشمولہ: تخلیقی عمل اور اسلوب)" ، نفیس اکیڈمی ،کراچی ، 1949ء، ص:124

2- شمیم احمد، "اردو کا زندہ و جاوید المیہ: عزیز احمد (مشمولہ: زاویہ نظر)"، روبی پبلشرز، کوئٹہ، 1987ء، ص:162

3- جمیل جالبی ،ڈاکٹر ،"جمیلہ ہاشمی کے دو ناول(مشمولہ: معاصر ادب)"،سنگ میل ،لاہور، 1991ء، ص:107

4- جیلانی کامران، "ہمارا ادبی و فکری سفر "،ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 1987ء، ص:205

5- ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، "راجہ گدھ: نظریاتی کمٹمنٹ کا ناول(مشمولہ: اردو ناول کے بدلتے تناظر)"، مجلس ترقی ادب، کراچی، ص:269

6- انتظار حسین، "بستی"، نقش اول کتاب گھر، لاہور، 1979ء، ص:127

7- جیلانی کامران ،"ادبی رویے اور قومی رابطے (مشمولہ :ہمارا ادبی و فکری سفر)"،ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 1987ء، ص:291

8- ای ایم فاسٹر ،"ناول کا فن (ترجمہ: ابوالکلام قاسمی)"، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ، 1996ء، ص:26

9. E.M Forster, "Aspect of Novel" New York, Eidited by Oliver_Stallybrass 1977, P:40

10. Water Allen "The English Novel" Penguins 1968, Volume 1 P: 27.

11۔ یوسف سرمست، ڈاکٹر "بیسویں صدی میں اردو ناول" ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۲۰۰۰، ص:26

12۔ منیر ابن رزمی، پروفیسر "ناول مانگی ہوئی محبت (دیباچہ)" انور سنز ساہیوال، ۲۰۱۸ طبع اول، ص:2

13- احمد صغیر، "اردو ناول کا تنقیدی جائزہ 1980ء کے بعد" ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی، ص:279

14- احتشام حسین، پروفیسر، "اردو ناول میں سوشلزم کے اثرات (مرتب: ڈاکٹر زرینہ عقیل)"، اسرار کریمی پریس، الہ آباد، پہلا ایڈیشن 1986ء، ص:193

15- اسلم آزاد، ڈاکٹر، "اردو ناول آزادی کے بعد" شعبہ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، نئی دہلی، 1983ء، ص:19

16- سید محمد عقیل رضوی، "جدید ناول کا فن (اردو ناول کے تناظر میں)"، نیا سفر پبلی کیشنز، الہ آباد، 1997ء، ص:64

17- سہیل بخاری، ڈاکٹر، "اردو ناول نگاری"، الحمر پبلشرز، دہلی، بار اوّل 1972ء، ص:31

18- سید محمد عقیل رضوی، "جدید ناول کا فن" نیا سفر پبلی کیشنز، الہ آباد، نومبر 1997ء، ص:80

19- محمد نصیر احمد، "ناول "اندھیرا پگ" ایک اجمالی جائزہ، مشمولہ: ساغر ادب (سہ ماہی)"، بہار یونیورسٹی مظفر پور، بہار، انڈیا، جولائی تا ستمبر 2021ء، ص:56

20- وارث علوی، پروفیسر، "اندھیرا پگ (فلیپ)" معیار پبلی کیشنز، دہلی، 2005ء

21- ثروت خان، "اندھیرا پگ (ناول)" معیار پبلی کیشنز، دہلی، 2005ء، پہلا ایڈیشن، ص:13

22- محولہ بالا، ص:50

23- محولہ بالا، ص:15

24- محولہ بالا, ص:69

25- محولہ بالا, ص:154

26- محولہ بالا، ص:13

27- محولہ بالا, ص:19

28- محولہ بالا, ص:48

29۔ محولہ بالا, ص:87

30۔ محولہ بالا, ص:57

31- شہاب ظفر اعظمی, "ثروت خان کا ناول "اندھیرا پگ" ایک مطالعہ،(مشمولہ: مباحثہ) پٹنہ، جنوری تا مارچ 2007ء, ص:82

32- ثروت خان, "اندھیرا پگ", معیار پبلی کیشنز، دہلی، 2005ء, ص:12

باب چہارم

ناول ''اندھیرا پگ'' میں خواتین کے سماجی مسائل کا جائزہ

1۔ عورت مختلف تہذیبوں کے تناظر میں:

عورت ایک نازک اور حساس موضوع ہے۔ عورت پر الگ سے اگرچہ بہت کم لکھا گیا ہے لیکن اردو کے بہت سے ناول نگاروں نے عورت پر قصے کی بنیاد رکھی ہے اور کچھ ناول نگاروں کے ہاں عورت محض ایک تخیل کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ زیادہ تر ناول نگاروں نے عورت کے کسی ایک پہلو کو سامنے رکھ کر اس کا پورا خاکہ پیش کیا ہے۔ یہی معاشرے کا وہ طبقہ ہے جو سماج کو بدلنے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ لہٰذا اردو ادب میں نذیر احمد دہلوی سے لے کر آج ثروت خان تک ایسا ادب تخلیق کیا گیا ہے جس میں عورت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ہر ناول نگار کا عورت کے بارے میں ایک مخصوص نقطہ نظر ہے جس کی بنا پر تحریر میں عورت کے متنوع پیکر سامنے آتے ہیں۔ کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے عورت کی حقیقت جاننا سب سے ضروری امر ہے جس کے لئے قدیم تہذیبوں کا مطالعہ نا گزیر ہے۔ مختلف ادوار اور تہذیب و تمدن میں تعلیمِ نسواں اور اصلاح نسواں پر زور دیا جاتا رہا کیونکہ عورت اپنے ساتھ پورے خاندان اور نسل کو سنوارنے کی طاقت رکھتی ہے۔

عورت نا صرف حسن و جمال رکھتی ہے بلکہ اللہ رب العزت نے اس میں محبت، غم گساری، نازک خیالی، لطیف جذبات و احساسات، نفاست اور سلیقہ شعاری کے جوہر بھی پیدا کیے ہیں۔ نسلِ انسانی کا فروغ اور تہذیب و تمدن کی ترقی کا انحصار عورت اور مرد کے باہمی تعاون اور مشترکہ عمل پر ہے۔ یہ عورت کے وجود کی کرشمہ سازی ہے کہ روح میں پاکیزگی، خیالات وعزائم میں بلندی اور زبان میں

حلاوت پیدا ہوتی ہے۔ ہر عہد میں مفکرین و مصلحین، مبلغین اور ناقدین نے عورت کے متعلق اپنے خیالات کا مقدور بھر اظہار کیا ہے۔ دنیا کے تمام دانشوروں، عالموں، فلسفیوں اور محققین نے اس کی عظمت اور اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔ شاعروں کے دیوان، اہل زبان کی مہارت اور اہل نظر کے تصورات اس کی دلیل ہیں۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ موضوع قدیمی بھی ہے اور وسیع بھی۔

پچھلے صفحات میں ہم نے یہی ثابت کیا کہ پتھر کے دور کا انسان جنگلوں میں رہتا تھا۔ اس دوران بے شمار نسلیں تہذیبی تاریخ کا حصہ بنتی رہیں۔ چٹانوں پر مصوری، پتھر کے مجسمے بنانے، شکار کرنے، مچھلیاں پکڑنے یا درختوں سے پھل توڑنے میں عورت یقیناً اس کے ساتھ ساتھ رہی ہوگی۔ اس زمانے کی عورت مضبوط اور جنگجو ہوگی جو مرد کے ساتھ کھلے مظاہر کا سامنا کرتی ہوگی۔ مرد کی ساتھی ہونے کے علاوہ عورت ماں بھی تھی اور یہ اس کی اضافی شان تھی جس سے مرد زیادہ مرعوب تھا۔ وہ تخلیق کے عمل کو عورت کا معجزہ تصور کرتا تھا۔ قدیم غاروں میں حاملہ عورتوں کی تصویریں اسی مرعوبیت کو ظاہر کرتی ہیں۔ یہ مرعوبیت آہستہ آہستہ عبادت میں تبدیل ہوگئی۔ تہذیبی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ غیر متمدن سماج میں عورت اپنی محنت، خدمت، ایثار اور قربانی کی بدولت مردوں کے دلوں میں باعزت مقام رکھتی تھی لیکن جیسے جیسے سماج تہذیب و تمدن کی منزلیں طے کرتا گیا مرد اپنی جسمانی صلاحیتوں کی بدولت حاکمانہ رویہ اپنا کر عورت پر غلبہ حاصل کرتا چلا گیا اور زمانے کی تبدیلی نے عورت اور مرد کے درمیان تفریق کی دیوار کو پختہ کر دیا۔ واضح رہے کہ نسلِ انسانی جب اپنی تعمیر و تشکیل کے ابتدائی مراحل میں تھی تو عورت خود مختار اور آزاد تھی۔ فہمیدہ کبیر اس بارے میں لکھتی ہیں:

> "نسلِ انسانی کے آغاز کے وقت عورت سماج میں آزاد اور بااختیار فرد کی حیثیت رکھتی تھی۔ سوسائٹی میں مردوں کی برتری قائم نہیں ہوئی تھی اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ محنت و مشقت میں عورت مرد کے ساتھ

برابر کی شریک تھی۔ اس کے گھریلو کام کی اہمیت بھی اتنی ہی تھی جتنی مرد کے کام کی۔ سماج کی بنیاد مشترکہ محنت اور مشقت پر تھی۔ معاشرے میں عورت کی برتری اور اہمیت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس دور کی تہذیب میں مادری تہذیبی تھی اور وراثت اور نسل کا سلسلہ باپ کے بجائے ماں سے چلتا تھا۔ لیکن انسانی سماج جیسے جیسے ترقی کی منزلیں طے کرتا گیا عورت کی خود مختاری اور اہمیت میں کمی ہوتی گئی بالآخر ایک منزل ایسی آئی جب عورت پر مرد کا مکمل اقتدار قائم ہو گیا۔ یہی منزل عہدِ تمدن کا آغاز ہے"(1)

مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یونانی تہذیب سب سے شاندار اور ترقی یافتہ تہذیب رہی ہے۔ ان کی شاعری، آرٹ، موسیقی، مذہب کا قانون، فلسفہ اور سائنس نے بعد کی تہذیبوں پر گہرا اثر ڈالا۔ اس کے باوجود یونانی معاشرے میں عورت تعلیم سے محروم تھی اور وہ پورے طور پر شوہر کی ملکیت تھی۔ شوہر جب چاہے اسے طلاق دے سکتا تھا۔ عورت کی تذلیل کی انتہا یہ تھی کہ اس کا شوہر اسے بطور تحفہ اپنے دوستوں کے حوالے کر دیتا تھا۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی لکھتے ہیں:

"یونانیوں کے ہاں عورت بڑی حقارت آمیز تھی۔ اولاد نہ ہونے کی صورت میں تو مرد کو اسے طلاق دینے کا پورا اختیار حاصل تھا بھلے ہی مرد خود بچے پیدا کرنے کی قوت سے محروم ہوتا۔ عورت کا بانجھ پن تو اس کے طلاق کے لئے کافی سبب تھا۔ عورت کی زندگی کا مایوس ترین پہلو اس سے بڑھ کر کیا اور ہو سکتا تھا کہ اہل یونان اسے صرف بیٹے پیدا کرنے کی مشین سمجھتے تھے"(2)

یونانیوں میں نفس پرستی کا غلبہ شروع ہوا تو بیسوا طبقہ کو عروج حاصل ہوا۔ یونانی شاعری میں عورت کا تصور معاشرے کے رجحانات کی عکاسی کرتا ہے یعنی وہ تباہی کا باعث ہے اور معاشی بوجھ بھی ہے۔ یونانی شاعری میں عورت کی تعریف تو ہے، بیوی کی نہیں۔ جس معاشرے میں گھریلو خواتین پر سختی ہو، انہیں پردے میں رکھا جائے، وہاں طوائفیں اور داشتائیں مردوں کے ساتھ محفلوں میں جاتی ہیں اور ان کے ذوق کی تسکین کرتی ہیں۔ مجموعی طور پر قدیم یونان میں عورت کا برا حال تھا اور وہ بنیادی حقوق سے محروم تھی۔

یونانیوں کے بعد جس قوم کو عروج حاصل ہوا وہ رومی تھے۔ یہ عروج صدیوں تک قائم رہا اور طلوعِ اسلام کے بعد ختم ہو گیا۔ رومی تہذیب میں بھی عورت کی سماجی حالت کا مطالعہ کرنے سے تلخ حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔ عورت کی حالت انتہائی بدتر تھی۔ مرد کا عورت پر جابرانہ تسلط قائم تھا۔ تمام معاملاتِ زندگی میں مرد کو فوقیت حاصل تھی۔ مرد خاندان کا سربراہ تھا۔ بعض حالات میں وہ اپنی بیویوں کو قتل کرنے کا مجاز بھی تھا۔ عورت غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔

تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اہل روم کے عورت کے بارے میں نظریہ تبدیل ہوا۔ رفتہ رفتہ عورت کو وراثت اور جائیداد میں حقوق دیئے جانے لگے جس کی وجہ سے رومی عورتیں معاشی طور سے خود مختار ہو گئیں۔ دولت کی فراوانی نے عورت کے آزادانہ اطوار کو فروغ دیا۔ جب اخلاق اور معاشرت کے بند ڈھیلے پڑے تو عریانی اور فحاشی کا فروغ ہوا۔ جسمانی نمائش اور عریانی و فحاشی کے مظاہرِ فن پیدا ہوئے۔ فلورا نامی ایک کھیل میں برہنہ عورتوں کی دوڑ ہوا کرتی تھی۔ عورتوں اور مردوں کے سر عام غسل کرنے کا رواج اس دور میں عام تھا۔ رومی لٹریچر فحاشی اور عریانی پر مشتمل مضامین سے پُر تھا۔ عام و خاص میں وہی ادب مقبول تھا جس میں استعارہ و کنایہ کے بغیر فحش گوئی تھی۔ اس طرح رومی خواہشات کے غلام ہو گئے اور ان کی عظمت پیوندِ خاک ہو گئی۔

دنیا کی قدیم ترین تہذیب کے کھنڈرات عراق سے دریافت ہوئے ہیں۔تاریخ میں اسے میسوپوٹامیہ، سمیری، بابلی یادجلہ وفرات کی تہذیب بھی کہا جاتا ہے۔ سمیری تہذیب ابتدائی تہذیب تھی اس لیے گناہ کا تصور پختہ نہ تھا۔ مذہبی طور پر عصمت فروشی کو تقدس کا درجہ حاصل تھا۔ معاشرہ بھی اس کے بارے میں سخت گیر نہ تھا۔ ان کے ہاں عورت کا دل آویز تصور موجود تھا۔ جیسے جیسے مردانہ سماج مضبوط ہوا قوانین میں سختی آتی چلی گئی۔ کسی لڑکی سے شادی، اس کے باپ کی اجازت اور زرِ کثیر خرچ کر کے کی جاسکتی تھی۔ سمیری تہذیب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں بھی عورتوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ڈاکٹر مشتاق احمد وانی سمیری معاشرے کی عورت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> "عورت کے تئیں سمیریوں کا معیارِ اخلاق اس قدر پست ہو چکا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو مالی پریشانی کے وقت بدکاری کرنے پر مجبور کر دیتے تاکہ وہ مال کما سکے۔ اسی طرح ان کے نکاح کا طریقہ بھی قابل مذمت ٹھہرتا ہے۔ وہ لڑکیوں کو (جب وہ شادی کے لائق ہو جاتیں) سال کے ایک مخصوص دن، ایک مقام پر جمع کر دیتے جہاں بے شمار مرد بھی موجود ہوتے تھے۔ پھر ایک دلال ان لڑکیوں کی خوبیاں اور حلیہ بیان کرتا اور بولی لگتی اور خرید و فروخت کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ لیکن ان تمام لڑکیوں کو اس شرط پر بیچا جاتا تھا کہ خریدار ان سے شادی کریں گے"(3)

سمیری معاشرے میں کثرت ازواج کا رواج موجود تھا۔ امراء اپنے حرم میں سینکڑوں کنیزیں رکھتے تھے جن کی حفاظت پر خواجہ سرا مامور ہوتے۔ کسی عورت کا شوہر تجارت یا جنگ کی صورت میں طویل مدت تک گھر سے غیر حاضر رہتا اور اپنی بیویوں کے نان نفقہ کی کفالت نہ کر سکتا تو وہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کی مجاز تھی اور پہلے شوہر کے تقاضا کرنے پر واپس اس کے پاس چلی جاتی تھی۔ مقدس مذہبی عورتوں کا باقاعدہ ایک طبقہ اس دور میں موجود تھا۔ ان کو معاشرے میں نمایاں

مقام حاصل تھا۔ یہ شادیاں بھی کرتیں، مذہبی علم برداری بھی کرتیں، کاروبار بھی کرتیں اور مندروں میں مذہبی تقریبات کا انعقاد بھی کرتیں۔ مذہبی دیوداسیوں کا یہ رواج آج تک قائم ہے۔ بت پرستوں کے علاوہ عیسایئت میں بھی اس رواج کو اپنایا گیا۔ مختصر یہ کہ سمیری تہذیب میں عورت کی حیثیت قابلِ رحم تھی۔ اس کے ساتھ ظلم و ستم اور حقارت کا رویہ رکھا جاتا تھا۔

سمیری اور بابلی تہذیب کے بعد مصری تہذیب نے عروج حاصل کیا۔ مصری معاشرے میں عورت کا رتبہ بلند تھا۔ معاشرے میں اسے مرکزی مقام حاصل تھا۔ عورت اپنے گھر میں خود مختار تھی۔ ساری املاک اسی کی جانب سے وارثوں کو ملتی تھی۔ شادی کے موقع پر شوہر اپنی جائیداد عورت کے نام منتقل کرتا تھا۔

مصری تہذیب میں عورت کی عزت کے باوجود کچھ چیزیں ایسی تھیں جنہیں کوئی بھی معاشرہ پسند نہیں کرتا تھا۔ رؤسا اپنی بہنوں سے نکاح کرتے تھے تاکہ وہ ان کے ورثے میں حقدار بن سکیں۔ بعض فراعین اپنی بیٹی سے نکاح کر لیتے تھے۔ ایسا کرنے کا جواز یہ پیش کرتے ہیں کہ ایسا کرنے سے ان کی اولاد میں ہر قسم کے شبہ سے پاک صاف ستھرا خون باقی رہے گا جب کہ اصل سبب جائیداد بچانا اور مالی منفعت ہی تھا۔ جائیداد اور وراثت عورت کے قبضے میں ہونے کے سبب مصری عورت کا درجہ بلند تھا۔ اس لیے شاہی عورتیں خصوصاً اور عام عورتیں بھی کسی حد تک جنسی رویے میں خاصی آزاد تھیں۔ دولت اور خوشحالی کے سبب بادشاہوں کے بڑے بڑے حرم ہوتے۔ عورت کی طرف سے آزاد رویوں کو کسی حد تک قبول کیا جاتا تھا۔

شمیم نکہت لکھتی ہیں:

"فراعینِ مصر کے آخری زمانے میں جب عیش کوشی اور ازواج پسندی کا دور آیا تو متعدد ازواج کا سلسلہ بہت بڑھ گیا اور عورتوں کے وہ حقوق جو

سماجی طور پر انہیں حاصل تھے مجروح ہونا شروع ہوئے۔ کچھ دنوں بعد
عورتوں کو اپنے حقوق کی فکر شروع ہوئی تو انھوں نے شادی کے لیے
مختلف شرطیں رکھیں۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ نکاح نامہ کی ایجاد سب
سے پہلے قدیم مصر میں ہوئی۔اس سے پہلے کسی ملک میں شادی کے وقت
شرط لکھ کر ان پر دستخط کرنے کا رواج نہیں تھا"(4)

اس عہد کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مصریوں کے ہاں دو قسم کی عورتیں تھیں باعزت اور فاحشہ۔ مجموعی طور پر مصریوں کے ہاں عورت کا تصور ایک باوقار اور شادکام عورت کا ہے۔

تقریباً 1500 قبل مسیح آریائی نسل کے قبائل دریائے دجلہ کے مشرقی حصے سے نکل کر دور دراز علاقوں میں پھیل گئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہیں سے ایرانی تہذیب کا آغاز ہوا۔ایرانی تہذیب میں عورت پردے میں رہتی تھی۔ بادشاہ کی ایک ہی ملکہ ہوتی لیکن حرم میں بہت سی کنیزیں ہوتیں۔پردے کا اہتمام یہاں تک کیا جاتا کہ اس زمانے کے مجسموں میں بھی کسی عورت کی شبیہ نظر نہیں آتی۔ لڑکیاں خونی رشتوں کے مردوں سے بھی میل جول نہ رکھتی تھیں۔ شادی ان عورتوں سے بھی کر لی جاتی تھی جن سے اسلام کی رو سے شادی حرام ہے۔ دیہاتی اور خانہ بدوش عورتیں باپردہ رہتی تھیں۔ ایسی زندگی امراء کی عورتوں کے لیے باعث رشک تھی۔ سرزمینِ ایران میں کئی بڑی تہذیبیں پروان چڑھیں تاہم عورتوں کی سماجی حیثیت بہت اچھی نہیں تھی۔ایرانی تہذیب میں بھی باپ کو بیٹیوں کی پیدائش ناپسند تھی۔ عورتوں کا استحصال اس تہذیب میں عام سی بات تھی۔ عورت مکمل طور پر مرد کے زیرِاثر تھی۔ پانچویں صدی عیسوی میں تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ بادشاہ یزد گرد دوم نے اپنی ہی بیٹی سے شادی کی اور بعد میں قتل کر ڈالا۔ عورتوں کے مخصوص ایام کو حقیر اور نجس تصور کرتے تھے۔ایرانی تہذیب میں ایسی عورتیں گھروں سے دور جا کر چھوٹے چھوٹے خیموں میں، جو شہر یا قصبوں کے مضافات میں لگائے جاتے تھے،

رہتی تھیں۔ ان کے ساتھ کسی کا ملنا جلنا جائز نہ سمجھا جاتا تھا۔ ان خیموں کو عورتوں کی ماہواری کے دنوں میں رہنے کی جگہ سے پہچانا جاتا تھا۔

مشہور چینی سیاح ہوئن سانگ کے مطابق قانون کی نظر میں عورت کا کوئی مقام نہ تھا۔ قدیم چین میں عورت کی حیثیت بابل اور یونان سے مختلف نہ تھی۔ عورت محض عیش و نشاط اور جنسی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ عورت کو ذہنی اور نفسیاتی جبر میں مبتلا رکھا جاتا تھا۔ مردوں کی کسل مندی کا یہ عالم تھا کہ وہ افیون کھا کر گھروں میں پڑے رہتے تھے اور عورتیں کما کر لاتیں۔ کسبِ معاش کی فکر نے چین میں عصمت فروشی کو ضرورت کے طور پر پروان چڑھایا جو آگے چل کر کئی سماجی برائیوں کا موجب بنی۔

قدیم عرب میں طلوعِ اسلام سے پہلے عورت کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ وحشیانہ سلوک عام سی بات تھی۔ پدر سری طرزِ زندگی رائج تھا۔ عورت کو اپنی املاک میں سے ہی ایک شے سمجھا جاتا تھا۔ خاندانوں کے اندر عورت کی عزت کی جاتی تھی یہاں تک کہ قبیلوں کی جنگوں میں ان سے مشورہ لیا جاتا تھا اور خیموں کے اندر کی زندگی میں وہی حاکم کا درجہ رکھتی تھی۔ عرب اونٹ، گھوڑے، بکری اور بھیڑ سے اپنی معیشت برقرار رکھتے تھے۔ عورتیں اس میں ان کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ بدو عورتیں خانہ بدوشی کی زندگی میں اپنے خاندانی معاملات کے تعلق سے اہمیت کی حامل تھیں اور اکثر کاموں میں مردوں کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ صحرائے عرب کے بدو جب ریگستان میں چراگاہ یا چشمے کی تلاش کی غرض سے اپنا جائے قیام بدلنا ضروری سمجھتے تو ان کا کام صرف یہ ہوتا تھا کہ وہ یوں ہی خالی ہاتھ اپنے اونٹوں کو لے کر چل دیں۔ پھر اب یہ عورت کا کام ہے کہ وہ خیموں کو اکھاڑے، سارا سامان اکٹھا کرے اور اونٹوں پر لاد کر لے جائے۔ عورتیں اس کام کو اس قدر سرعت کے ساتھ انجام دیتیں کہ مردوں کا قافلہ دور نہیں پہنچتا کہ یہ بھی سارا اسباب لے کر ان سے مل جاتیں۔ اس کے باوجود سماجی حیثیت سے عورت کو دستِ نگر ہی رکھا گیا۔ اس کی

حیثیتِ خاندانی اس وقت بڑھ جاتی جب وہ اولاد نرینہ پیدا کرتی تھی۔ بیٹیوں کو زندہ دفن کرنے کا چلن عربوں میں عام تھا۔ اس کا بڑا سبب یہ بتایا جاتا تھا کہ عربوں کا قبائلی تفاخر جہالت کی اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ وہ کسی شخص کو اپنی بیٹی دے کر اس کے آگے سر تسلیم خم کرنے کے قائل نہ تھے۔ عورت کو عرب سماج میں جائیداد کی حیثیت حاصل تھی۔ عورت کے بیوہ ہونے کے بعد اس کا بیٹا اس سے شادی کر لیتا تھا۔

عرب جن عورتوں سے شادی کرتے تھے ان کی حیثیت کے بارے میں تو کچھ رواجی قانون تھے لیکن تعداد کے سلسلے میں نہ تو کوئی قانون تھا اور نہ ہی کوئی رواج۔ عورت محض جنسی تسکین کا ذریعہ تھی۔ وحشت و بربریت کا یہ دور عورت کی عصمت فروشی کے دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عورت ظلم واستبداد کا شکار تھی اور وہ ان تمام سماجی اور رواجی حقوق سے محروم تھی جن کی وہ پیدائشی طور پر حقدار تھی۔ لیکن اسلام کے بعد عورت پر اس روا رکھے گئے ظلم و ستم کا خاتمہ ہوا۔

ہندوستانی سماج میں ہندوستان کی قدیم تہذیب اور ثقافت کے بارے میں مکمل واقفیت ویدوں کے مطالعے سے ہوتی ہے۔ ویدک دور (1500 سے 1000) کو عورتوں کا سنہری دور سمجھا جاتا ہے۔ اس دور میں عورتیں زندگی کے تمام شعبوں میں مردوں کے شانہ بشانہ رہیں اور میں تعلیم و تبلیغ، فن تعمیر، موسیقی اور رقص کے ہنر میں پیش پیش تھیں۔ کسی طرح کی سماجی پابندی عائد نہیں تھی۔ انہوں نے گروکل *4 میں مردوں کی ویدوں کی تعلیم حاصل کی اور بہت سی عورتوں نے آرٹ اور فن سپاہ گری میں مہارت حاصل کی اور اپنے جوہر دکھائے۔

4۔ گروکل *: سنسکرت زبان کا لفظ۔ قابل تعظیم درس گاہ، محترم، معلم

5۔ سوئمبر *: عالی نسب ہندوؤں اور راجاؤں میں یہ رواج تھا کہ ایک مقررہ دن ایک تقریب منعقد کی جاتی جس میں علاقے کے خواہش مند نوجوان اپنے کرتب اور ہنر دکھاتے اور لڑکی اپنی پسند کے خاوند کو منتخب کرنے کے لیے اس کے گلے میں ورمالا ڈال دیتی۔ اس رسم کو سوئمبر کہا جاتا تھا۔

کرک وید جو ہندو مذہب کی بنیادی اساس مانی جاتی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ عورت کو مذہبی تعلیم و تربیت کی پوری آزادی حاصل تھی اور معاشرے میں اسے وہ تمام سہولتیں حاصل تھیں جو مردوں کو میسر تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں عورت نمایاں نظر آتی ہے۔ مذہبی تنظیموں اور اداروں میں پیش پیش رہنے کے ساتھ اجتماعات میں بھی بھرپور حصہ لیتی تھی۔ شادی کے معاملے میں خود سے لڑکیوں کو شوہر چننے کا پورا اختیار حاصل تھا۔ انتخاب کی اس رسم کو سوئمبر *[3] کہا جاتا تھا۔ عورتوں کو اختیار حاصل تھا کہ اگر وہ چاہیں تو پوری زندگی شادی کے بغیر خود کو تعلیم کے لئے وقف کر دیں۔ بیوہ عورتوں کی دوسری شادی پر کوئی ممانعت نہیں تھی۔ ان کو گوشہ نشینی کے لئے مجبور نہیں کیا جاتا تھا نہ وہ تارکِ دنیا ہوتی تھیں۔ اس عہد میں ستی کی رسم کا دور دور تک چلن دکھائی نہیں دیتا۔ ویدک عہد کے بعد آہستہ آہستہ عورتوں کی سماجی حیثیت میں پستی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ ان کے اختیارات محدود ہوتے چلے گئے۔ تعلیم میں بھی ان کی حیثیت کم ہوگئی کیونکہ اب عورت کی عصمت اور پاکدامنی پر زیادہ زور دیا جانے لگا اس لیے اسے درسگاہوں اور علماء کے پاس بھیجنے کے بجائے گھر پر ہی اپنے کسی بڑے سے تعلیم حاصل کرنے کو بہتر سمجھا جانے لگا۔

عورتوں کے لئے وید اور مقدس کتابوں کو ہاتھ لگانا جرم قرار دیا گیا۔ برہمن دور میں عورت کا درجہ کم کرنے کے لیے مختلف اقدامات کیے گئے مثلاً وراثت میں انہیں غیر مستحق قرار دیا گیا۔ جب سوتروں، سمرتیوں، پرانوں، رزمیہ داستانوں یعنی رامائن بھارت کا عہد آیا تو عورت کی حیثیت اور بھی زیادہ خراب ہو گئی جب ہندوستان میں منو کے اصول رائج ہو گئے اور ان کو ہندو سماج درجات حاصل ہو گئے تو عورت کی آزادی اور اس کی سماجی حیثیت شودر کے درجے تک پہنچ گئی۔

ڈاکٹر مہ جبین نجم اپنے تحقیقی مقالے میں منو کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> "عورت دنیا میں مرد کو ورغلاتی ہے اس لئے کوئی بھی شخص اس کی محبت میں رہ کر محفوظ نہیں رہ سکتا۔ عورت کو اپنے بستر، گھر، زیورات، ناپاک خواہشات، غصہ، بے ایمانی، کینہ پن اور بد اطواری سے ہی محبت ہوتی ہے۔اس لیے عورتوں کو مقدس کتابیں پڑھنے کی اجازت نہیں" (6)

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات سامنے آئی کہ عورتیں وید نہیں پڑھ سکتی تھیں۔ان پر تعلیم کے دروازے بند تھے۔ مرد کے سہارے کے بغیر عورت غیر محفوظ سمجھی جاتی تھی۔ بچپن میں اس کا محافظ باپ، جوانی میں شوہر اور بڑھاپے میں بیٹا اس کو تحفظ دیتا تھا۔ مردوں کو شادی کرنے کا حق حاصل تھا لیکن بیوہ عورت دوسری شادی نہیں کر سکتی تھی۔

ڈاکٹر مہ جبین منو کے تصورات کو ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں:

> "منو* 6 نے عورت کی انفرادیت کو کچل کر رکھ دیا تھا۔بیوی کی حیثیت سے اس کی انفرادیت شوہر کی ذات میں گم ہو جاتی تھی۔ وہ گوشہ نشینی اختیار کرنے پر مجبور کی جاتی تھی۔ کم سنی میں اسے شادی کے بندھن میں باندھ دیا جاتا تھا اور بیواؤں کو کڑی اطاعت کی زندگی گزارنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کے قوانین میں اگر کچھ رعایت تھی تو بس اتنی کہ ماں کے مرتبے کی اور عورت کی جبلی اچھائیوں کی حمایت کی جائے، ان کی خطاؤں کو معاف کرنے میں نرمی سے کام لیا جائے اور گھر کی دیکھ بھال میں انہیں

6۔ منو*: ہندوؤں کی اساطیر میں منو کا لفظ مستعمل ہے۔ یہ سوچ اور غور و فکر کے معنوں میں آتا ہے اور سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔ منو کوئی انفرادی وجود نہیں بلکہ کل انسانوں کی وحدت ہے۔ ہندوں کے مطابق انسان کا ظہور جن دس پر جاتیوں سے ہوا ہے وہ منو سے ہی نکلی ہیں ان پر جاتیوں کو مہا پرش بھی کہا جاتا ہے۔ برہما کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے خود منو کے روپ میں جنم لیا۔

بزرگی عطا کی جائے۔اس رعایت کے باوجود ان کا کہنا تھا کہ دن رات کو عورت کو اس کے محافظوں کی محکومی میں رکھا جائے کیونکہ ضعیف الارادہ، تیز مزاج، ضدی، کمزور اور راہ راست پر جینے والی نہیں ہوتی اور محض زیورات اور گھٹیا خواہشات اس کا سرمایہ ہوتے ہیں"(7)

ان قوانین نے معاشرے پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے۔ سماج میں لڑکی کا پیدا ہونا پچھلے جنم کے گناہوں کی سزا سمجھا جاتا تھا۔ نو مولود بچیوں کو مار دینا سماج سے نجات پانے کا واحد راستہ تھا۔ عورت بیوہ ہو جاتی تو اسے صرف منحوس اور مکروہ نہیں سمجھا جاتا بلکہ اسے شوہر کی جلتی چتا میں کود جانے کا عملی مظاہرہ کرنا پڑتا تھا۔ ہندوستانی سماج میں عورت کی مظلومیت اور بے بسی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو گا کہ شوہر کی چتا پر نذر آتش ہونے کے لیے اسے مجبور کیا جاتا تھا اور اس کو باور کرایا جاتا ہے کہ اس کی فلاح اور نجات ستی *[7] ہو جانے میں ہی پوشیدہ ہے۔ دوسری طرف ستی * نہ ہونے والی عورت کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

اس کا سر منڈوا کر اس کی ظاہری ہیئت بگاڑ دی جاتی تھی تاکہ کوئی مرد اس کی طرف رجوع نہ کر سکے۔ اسے بد قسمت سمجھا جائے اور وہ کسی خوشی کی تقریب میں نہ جا سکے۔ عورتوں کی اس بے چارگی کے عہد میں چند عورتیں سماجی لحاظ سے بہتر نظر آتی ہیں جو اپنی لیاقت اور صلاحیت کی بنا پر بلند مرتبت ٹھہریں۔ سیتا، ساوتری، دروپدی اور دمنی اپنے علم و فکر اور فلسفے کی بنیاد پر نامور ہوئیں۔ ہر عہد اور زمانے کے ساتھ سماجی اقدار تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ ویدک کے بعد بدھ مت کے عہد میں عورت کی سماجی حیثیت کا ایک بار پھر احیاء ہوا۔ گوتم بدھ نے عورت سے متعلق برہمنوں کی سختیوں کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ بدھ دور

7۔ ستی: یہ رسم ساتویں صدی میں راجپوتوں کے دور سے شروع ہوئی اور انگریزوں کے دور تک جاری رہی۔ اس رواج کے مطابق جب کسی عورت کا شوہر وفات پاجاتا تو اس کی چتا کے ساتھ ہی عورت بھی جل کر مر جاتی۔ یہ رسم ستی کہلاتی تھی۔ اگر کوئی عورت ستی نہ ہوتی تو اسے جانوروں جیسی زندگی جینے پر مجبور کیا جاتا

میں عورت کو اعلیٰ مذہبی تعلیم اور متبرک مذہبی کتابوں کی تلاوت کا حق دیا گیا۔ بدھ مذہب میں جو اصلاحی تحریک چلائی اس میں رہنما کی حیثیت سے بہت سی عورتیں بھی شامل تھیں۔ فنونِ لطیفہ اور رقص و موسیقی میں انہیں بادشاہوں کی حمایت اور سرپرستی حاصل تھی۔ جینی عہد میں بھی عورتیں اس آزادی کے ساتھ زندگی کے مختلف شعبوں میں حصہ لے سکتی تھی۔

دور وسطیٰ یعنی آٹھویں صدی عیسوی سے اٹھارہویں صدی عیسوی تک عورت کی حالت میں کچھ خاص تبدیلی نہیں آئی لیکن برہمنوں نے اپنی کھوئی ہوئی طاقت حاصل کی تو پرانی رسم دوبارہ سر اٹھانے لگی۔ عورت ایک بار پھر زبوں حالی اور ظلم و ستم کا شکار ہونے لگی۔ بچپن کی شادی اس دور کی سب سے بڑی لعنت تھی۔

عام عورتوں کے برعکس راجپوت خواتین، سلاطین، دہلی یا مغلیہ بادشاہوں کی بیگمات، شہزادیوں اور امیر زادیوں کی حالت کافی بہتر تھی۔ ہندو عورت کے لیے حسب سابق وید کا پڑھنا ممنوع تھا کیونکہ وہ شودر سمجھی جاتی تھی۔ تعلیم کے دروازے عورت پر بند کر دیے گئے صرف اونچے گھرانوں میں نام نہاد تعلیم کا چلن تھا لیکن کچھ عرصے بعد یہ رواج بھی ختم کر دیا گیا۔

اس دور میں لڑکیاں آٹھ سے بارہ سال کے درمیان رشتہ ازدواج میں باندھ دی جاتی تھی جس سے ان کی صحت پر بھی اثر پڑا۔ بچپن کی شادی نے ماں اور بچے دونوں کے موت کے تناسب میں اضافہ کر دیا۔ اس عہد کی مسلمان عورتوں کی سماجی حالت بھی بہت بہتر نہیں تھی۔ مردوں کی عظمت اور بڑائی کے سامنے حقیر اور کمتر ہی تصور کی جاتی تھیں۔ وہ مکمل طور پر مرد کی دستِ نگر اور اس کی دل بستگی کا سامان تھیں۔ اگرچہ اسلام میں قرآن و حدیث کی رو سے عورت کو شوہر کے انتخاب کا حق، حق مہر کا تعین کرنا، نان نفقہ کا حق، وراثت اور دیگر مال و جائیداد کے رکھنے کا حق، تعلیم اور کاروبار کا حق، طلاق خلع یا بیوگی کے

بعد دوسری شادی کا حق، عمل کی آزادی کا حق دے رکھا ہے۔ لیکن مردوں نے ان حقوق سے چشم پوشی اختیار کیے رکھی اور یہ سلسلہ کسی حد تک ہنوز جاری ہے۔

مشترکہ تہذیب کی بدولت ہندو سماج میں بیوی کی حیثیت کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں نے اسلام میں بیوہ سے نکاح جائز ہوتے ہوئے بھی اسے معیوب سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ جاگیردارانہ عہد نے عورت کی سماجی حیثیت پر کاری ضرب لگائی۔ جہاں چار دیواری کے اندر زنان خانے میں گھٹ گھٹ کر مر جانا ہی ان کا مقدر ہوتا تھا۔ عیش کوشی کے شوق نے عورت کو مغنیہ اور رقاصہ بنانے کے ساتھ ساتھ قحبہ خانوں کی زینت بنا دیا۔ اب اجناس کی طرح منڈی میں اس کی قیمت بھی لگنے لگی۔ طوائف اس دور کی سوسائٹی کا اہم جز تھی۔ یہ گھریلو قسم کی نہیں ہوتی تھی بلکہ علمِ موسیقی میں ماہر، آداب و اخلاقیات میں مرصّع اور اداؤں سے لبریز ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ طبقہ وقت کی ضرورت اور جنسِ بازار بن گیا۔

عہدِ وسطیٰ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ شاہی خاندانوں اور امراء کی خواتین میں تعلیم کا رواج ترکوں اور مغل بادشاہوں کے ہاں بھی تھا اس دور میں بھی ایسی خواتین کا تذکرہ ملتا ہے جنہوں نے اپنی تعلیم و تربیت جاری رکھتے ہوئے سیاست، ادب، فلسفے، سپہ گری اور بالخصوص فنونِ لطیفہ میں اپنی قابلیت اور ہنر مندی کا ثبوت پیش کیا۔ ان خواتین میں التمش کی صاحبزادی رضیہ بیگم، جلال الدین خلجی کی بیوی ملکہ جہاں، بہلول لودھی کی ہندو بیوی، سکندر لودھی کی ماں اور بابر کی ماں سیاسی امور میں مشورہ دیا کرتی تھیں۔ ہمایوں کے عہد میں سب سے زیادہ اہمیت اس کی پھوپھی یعنی بابر کی بہن خنزادہ بیگم کو حاصل تھی۔ جہانگیر کے عہد میں سب سے اہم عورت نور جہاں تھی۔ نور جہاں کی سیاسی لیاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے مہابت خان کی بغاوت کو کچل کر رکھ دیا۔ اسی طرح شاہ جہاں کی بیوی ممتاز محل کا سیاست میں اہم رول رہا ہے۔ ممتاز کی موت کے بعد شاہجہاں کی دو بیٹیاں جہاں آرا اور روشن آرا نے سیاسی امور میں حصہ لیا۔ اورنگزیب نے عام طور پر عورتوں کی مداخلت کو کارِ سرکار میں مناسب نہیں سمجھا

لیکن ان کی بیٹی زیب النساء نے سیاست اور فنونِ لطیفہ میں دلچسپی لی۔ اسی زمانے میں مغل خاندان کی چند عورتوں نے شعر و ادب کے میدان میں بھی نمایاں مقام حاصل کیا۔ یہ صورتحال امراء کی عورتوں کی تھی جنہیں تمام حقوق میسر تھے لیکن عام عورت کی حالت بتدریج روبہ زوال تھی۔

اس بارے میں فہمیدہ کبیر رقمطراز ہیں:

> "ابتدائی عہد میں مسلمان عورت کی حالت ہندو عورت کی بہ نسبت اس لیے بہتر تھی کہ اس کا تعلق فاتح اور حکمران قوم سے تھا لیکن رفتہ رفتہ مسلمان بھی ہندو معاشرے سے متاثر ہوتے چلے گئے اور عورتوں کے ساتھ ان کا رویہ بھی اس سے مختلف نہ رہا جو ہندو سماج میں روا سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ مسلمان عورت کا سماجی رتبہ بھی بتدریج پست ہوتا گیا۔ اس عہد کی اخلاقی پستی کی بدولت عورت کو اس کے بنیادی حقوق سے محروم کر دیا گیا"(8)

بچپن کی شادی اور بیوہ کی شادی نہ ہونا عورت کے زوال کے اہم اسباب تھے۔ تعلیمی لحاظ سے عورتیں بہت پیچھے تھیں۔ متوسط اور پسماندہ طبقے میں عورتوں کو مردوں کی توہم پرستی کی اندھی تقلید کی وجہ سے لڑکیوں کی بے جوڑ شادی ہوتی تھیں۔ بے جوڑ شادیوں کی وجہ سے تعدادِ ازواج میں اضافہ ہونے لگا۔ مرد گھروں سے باہر ناجائز تعلقات رکھنے لگے۔ اس دور میں ہندو یا مسلم دونوں کی حالت بہتر نہیں تھی۔ اس دور میں صوفیوں نے روحانیت کو فروغ دینے کے ساتھ سماجی مسائل کی طرف رجوع کیا اور عورتوں کی سماجی حیثیت کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔

1857ء کا انقلاب ہندوستانی معاشرے کیلئے ایک سنگ میل ثابت ہوا ہندوستانیوں کی شکست کا مطلب مغرب کی بالادستی تھا۔ اس ہنگامے نے ہندوستان میں سیاسی، معاشرتی، اقتصادی، تہذیبی اور

اخلاقی اعتبار سے زبردست تبدیلیاں پیدا کیں۔ ہندوستان کے مصلحین نے عورتوں کی زبوں حالی اور بیچارگی سے متاثر ہو کر عورتوں کی بہبود، آزادی اور بہتری کے لیے کام کیا۔ ان لوگوں نے عورتوں میں تعلیم کی اشاعت، عقدِ ثانی، کم سنی کی شادی کی مخالفت اور عورتوں کے دوسرے معاشرتی مسائل کے لیے آواز بلند کی۔ انیسویں صدی تک ان کوششوں کے نتیجے میں خود بیداری پیدا ہو گئی۔ نظام کی بدلتی ہوئی صورتحال نے عورتوں کی حالت میں قدرے تبدیلی پیدا کر دی۔ روشن خیال افراد نے سماجی، مذہبی اور اصلاحی تحریکات کے ذریعے عورت کو بہتر مقام دلانے کے لئے بھرپور کوشش کی جس سے خواتین کے منظر نامے میں بہتر اور مثبت نتائج برآمد ہوئے۔

2۔اردو ناول میں تانیثیت:

تانیثیت ایک اصطلاح ہے جس کے مختلف معنی، مسائل، تصورات اور زاویے ہیں۔ اردو ناول کی ڈیڑھ صدی میں ناول نگاروں نے غالب مرد معاشرے پر محض طنز نہیں کیا بلکہ نفسیاتی دباؤ، معاشی اور جنسی استحصال، خوف، جبر اور دہشت کے ماحول کو فنکارانہ ڈھنگ سے اجاگر کیا ہے۔

رشید النساء کے ناول "اصلاح النساء" سے لے کر آج اکیسویں صدی تک طویل فہرست ہے جن میں رشتوں اور قدروں کو لے کر شناخت، تشخص اور انا کے موضوع پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ اردو ناول نگاروں نے عورت کے استحصال، عدم مساوات، توہمات اور تعصبات، تنگ نظری، رقابت، حسد، جنسی ناآسودگی پر بھی کہیں زیرِ لب اور کہیں کھل کر لکھا ہے۔ "عورت صرف بچے پیدا کر سکتی ہے" عورت کے اندر یہ سوچ کج روی پیدا کرتی ہے۔ بغاوت عورت کو سماج سے ٹکرانے کا حوصلہ اور معاشرے سے انتقام لینے کی قوت عطا کرتی ہے۔

تقسیم سے پہلے عورت کے حوالے سے لکھے جانے والے زیادہ تر ناول اصلاحی تھے۔ عصمت چغتائی نے پہلی بار عورت کی آواز میں درشتی اور باغیانہ پن محسوس کرایا۔ انہوں نے تقریباً انہی مسائل پر

قلم اٹھایا جو پہلے سے موضوعِ بحث بن رہے تھے۔ لیکن بُنت، برتاؤ اور لب و لہجہ کے اعتبار سے ناول کو جدت اور ندرت عطا کی۔ رائج موضوعات کو نئے رنگ، نئی شکل، نئے انداز سے پیش کیا۔ انہوں نے عورت کے مصائب و آلام کو عورت ہی کی زبان میں رقم کیا۔ "ٹیڑھی لکیر" اور "ضدی" میں گھریلو زندگی کی نفسیات اور ماحول کے اثرات کردار سازی کی بنیاد ہیں۔

رضیہ سجاد ظہیر، صالحہ عابد حسین، شکیلہ اختر، ممتاز شیریں، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، صدیقہ بیگم، واجدہ تبسم، رضیہ فصیح احمد، جمیلہ ہاشمی، بانو قدسیہ، جیلانی بانو، نثار عزیز بٹ وغیرہ وہ قلمکار خواتین ہیں جنہوں نے عصمت چغتائی کی سماجی تبدیلیوں کے عمل کو تقویت بخشی اور استحصالی قوتوں کو نشانہ بنایا۔

تقسیم کے بعد لکھے گئے ناولوں میں بیشتر تقسیم ہند اور فرقہ وارانہ فسادات کے تناظر میں لکھے گئے۔ پریم چند کے بعد طبقاتی سماج سے تعلق رکھنے والے افراد کی زندگیوں پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ تقسیم کے سانحے کے بعد زندگی کے نشیب و فراز اور قتل و خون کی وارداتوں نے ادیب کے ذہن کو اس قدر مضمحل کر دیا کہ وہ زندگی کے دیگر مسائل کو اہمیت نہ دے سکا جن میں ایک عورت کی شناخت اور اس کے حقوق کا مسئلہ تھا۔

ابتدائی دور کے ناول نگاروں کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے نام بھی سامنے آئے جنہوں نے بڑے ناول نگاروں کے سائے تلے اپنے فن کا آغاز کیا اور بڑی حد تک ان کی پیروی کرتے ہوئے ان لکھنے والوں کی روایت کے تسلسل کو برقرار تھا۔ ان ناول نگاروں میں قاری سرفراز حسین دہلوی (1934ء–1867ء) کے ناول اس لیے اہمیت کے حامل ہیں کہ انہوں نے باقاعدہ طور پر "سلسلۂ الطوائف" اور پھر "اصلاح شرفاء" کے نام سے ناولوں کے دو سلسلے تحریر کیے۔ ان کے تقریباً تمام ناولوں کی ہیروئینیں (طوائفیں) اپنے پیشے کی بھول بھلیوں سے گزرتی ہوئی آخر کار ایک شریفانہ زندگی کا نصب العین حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ ان کے ناول طوائف کی باعزت زندگی کے حصول کی خاطر ایک داخلی اور

خارجی کشمکش کی روداد ہیں۔ عورت کو طوائف کے روپ میں ڈپٹی نذیر احمد اور سرشار دونوں نے پیش کیا ہے۔ عبدالحلیم شررؔ کی تقلید میں محمد علی طیب نے تاریخی اور معاشرتی دونوں قسم کے ناول لکھے۔ ان کے معاشرتی ناول "گورا" میں عقدِ بیوگان کی ضرورت اور اہمیت کو دلائل سے ثابت کیا گیا ہے۔ ان کے ایک ناول "اختر و حسینہ" میں تعلیمِ نسواں اور بنا رضامندی کے شادی کے نتائج دکھائے گئے ہیں۔ مرزا محمد سعید کے ناول "خوابِ ہستی" اور "یاسمین" (1905ء) میں تعلیمِ نسواں کے فوائد کے ساتھ ساتھ نقصانات بتادیے گئے ہیں۔

یورپ کی دوسری تحریکوں کی طرح 1900ء سے 1920ء کے درمیان قدروں سے بیزاری اور بغاوت کے رجحان کے سبب لوگ رومانیت میں پناہ ڈھونڈنے لگے۔ رومانیت میں جمال پرستی غالب تھی اس لیے حُسن و عشق کی پرستش ہونے لگی۔ حُسن کے ساتھ عشق اور عشق کے ساتھ عورت کا تصور ناگزیر ہے۔ اس لئے یہی زندگی کا معیار ٹھہرا۔ رومانیت کی ابتداء میں خواتین کے مسائل کی طرف سے چشم پوشی اختیار کی گئی۔ نیاز فتح پوری کا ناول "شہاب کی سرگزشت" اور کشن پرشاد کا ناول "شاما" ایسے ہی رجحان کی نشاندہی کرتے ہیں۔ عظیم بیگ چغتائی نے مزاحیہ اور طنزیہ رنگ میں عورت کی سماجی حیثیت پیش کی۔ لکھنوی تہذیب میں عورت کے شب و روز کے بہترین عکاس مرزا ہادی رسوا ہیں۔ اردو ناول میں طوائف کو موضوع بنا کر اسے عورت کی تذلیل قرار دیا گیا ہے لیکن یہ سچ ہے کہ عورت کو اس دلدل سے نکالنے کا کوئی طریقہ نہیں بتایا گیا۔ 1935ء کے بعد ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کی ہر صنف کو وسیع پیمانے پر متاثر کیا۔ اس تحریک میں فن و ادب کے تمام عقائد و تصورات کو بدل کر رکھ دیا۔ کرشن چندر نے اردو ناول کو نیا لب و لہجہ اور مزاج عطا کیا۔ 1943ء میں ان کا پہلا ناول "شکست" شائع ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے بے شمار ناول لکھے۔ ایک اندازے کے مطابق انہوں نے پچاس کے قریب ناول لکھے۔ (9)

کرشن چندر نے ناول "شکست" میں عورت کے کردار کو باغیانہ پیش کر کے ایک جرات مندانہ قدم اٹھایا۔اسی کردار کا نکھرا ہوا روپ ان کے باقی کئی ناولوں میں نظر آتا ہے۔ کرشن چندر نے ایسے سماج کو طنز کا نشانہ بنایا جہاں مردوں کی حکومت ہو لیکن عورتوں کا مقام اور احترام نہ ہو۔

عزیز احمد کا زمانہ ماضی سے بغاوت کا ہے۔ اس دور میں جدید ادب میں جنسی موضوعات ناولوں میں تبدیلی کا مظہر بن کر آئے تھے۔ ان کے ناولوں کا بنیادی خیال عورت اور اس کی جنسی کشش ہے۔ جہاں ان عناصر کی کار فرمائی ہو گی وہاں لازمی تلذّذ ہو گا۔انہوں نے عقل، جذبات، محبت، ہوس، اور مرد وزن کے تعلقات کی کشاکش کو پیش کیا ہے۔

قرۃالعین حیدر نے جس دور میں پرورش پائی تھی وہاں ایک طرف تو دہلی کی تہذیب دم توڑ رہی تھی اور دوسری طرف نیا ماحول جنم لے رہا تھا۔ بمبئی کاروباری سطح پر مستحکم تھا صرف لکھنؤ ایسا شہر تھا جہاں مالی آسودگی، ٹھہراؤ، تہذیب و تمدن اور اپنی اقدار کی پاسداری کا لحاظ تھا۔قراۃالعین حیدر کے ناول تہذیبی پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ان کا اپنا مشاہدہ بھی بہت وسعت لیے ہوئے ہے۔ یوں ان کے ہاں جو عورت نظر آتی ہے وہ اپنے جذبات، خواہشات اور تمناؤں سمیت فنی تقاضوں کے زیر اثر اپنے ارتقائی عمل سے گزر کر قاری کے سامنے آتی ہے تو دھند میں لپٹی ہوئی نہیں بلکہ مزید چمکدار رنگوں سے آراستہ ہوتی ہے۔ ان کی عورت حکمرانی کرنے والی، وضع دار، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مہذب ہے جس کی مثال ان کے ناولوں "میرے بھی صنم خانے میں"" گردش رنگ چمن "اور "چاندنی بیگم "میں ملتی ہے۔

فضل کریم فضلی نے مشرقی بنگال کے تہذیبی و معاشرتی اور سیاسی حالات کو اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔ ان کے ناول میں قحط کی تباہ کاریوں کے تناظر میں عورت کی بے بسی اور بے کسی دکھائی گئی ہے۔ ان کے ہاں عورت قربانی کے جذبے سے سرشار ہے خصوصاً "خون جگر ہونے تک "میں بی بی جان قحط کے دنوں میں اپنے بیٹے اور شوہر کے لئے چاول بناتی ہیں اور خود چاول کی پیچ میں نمک ڈال کر کھاتی ہیں۔ جنگ

کی وجہ سے اس وقت بنگال میں جگہ جگہ فوجی کیمپ تھے۔ فاقہ زدہ عورتوں کو دیکھ کر ترس کھانے اور منہ پھیر لینے کے سوا اور کوئی جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا تھا مگر انسانیت سے عاری فوجی، ان قحط زدہ عورتوں کا استحصال اپنی جنسی بھوک مٹانے کے لئے کر رہے تھے۔ انسانی اقدار کی پستی کا یہ بدترین نمونہ ہے۔

شوکت صدیقی نے پاکستان کے عصری مسائل کو اپنے ناولوں میں کلیدی حیثیت دی ہے۔ بیشتر ترقی پسندوں کی طرح شوکت صدیقی بھی عورت کے بارے میں خاص تصور رکھتے ہیں۔ وہ عورت کو دہرے استحصال کا شکار سمجھتے ہیں۔ مرد کی سماجی برتری اور توہم پرستی ان کے ہاں عورت کے دو بڑے مسائل ہیں۔ معاشرے میں شوہر کی عدم موجودگی عورت کے مسائل میں اضافے کا سبب بنتی ہے جس کی مثال "خدا کی بستی" کی ماں سلطانہ ہے۔ جس سے معاشرہ نکاح کی اجازت دے کر تحفظ فراہم کرتا ہے لیکن اس بیوہ کی اگر پہلے سے بیٹی موجود ہے تو اسے اس کے سوتیلے باپ سے تحفظ فراہم کرنا زیادہ مشکل ہوگا۔ شوکت صدیقی نے اپنے ناولوں میں عورتوں کے مسائل اور ان کی سماجی حیثیت کی وضاحت کی ہے۔ اپنے ناول "جانگلوس" میں وہ جاگیردرانہ نظام معاشرت میں عورت کی کسمپرسی کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان کے ہاں عورت مردانہ سماج کے ہاتھوں ہر سطح پر استحصال کا شکار ہے۔

ڈاکٹر احسن فاروقی کے ناول ان کے مشاہدے کی قوت کے آئینہ دار ہیں۔ احسن فاروقی کے ناولوں میں عورتوں کی تین اقسام ہیں۔ ایک قسم اعلیٰ طبقے کی نوابین کی بیویاں بیٹیاں اور بہوئیں ہیں۔ دوسری متوسط طبقہ کے شریف گھرانوں کی لڑکیاں اور تیسری لونڈیاں، رنڈیاں۔ احسن فاروقی نے اپنے ناول "شامِ اودھ" میں کنیزوں کو بیگمات کی نسبت جرات مند اور ذہانت میں افضل دکھایا ہے۔ احسن فاروقی کے ہاں عورت کنیز کے روپ میں محبت، وفا اور دانائی کی علامت ہے لیکن وہ بیگمات کے منصب تک نہیں پہنچتی۔ متوسط گھرانوں کی عورت اعلیٰ طبقے کی بیگمات کے مقابلے میں مردوں پر زیادہ حاوی

دکھائی دیتی ہے جس کی مثال "سنگِ گراں" کی عابدہ ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ متوسط طبقہ کی عورت کو محبت میسر تھی بلکہ اسے مرد کی رفاقت میسر تھی۔

ممتاز مفتی نے اپنے ناولوں میں نہایت غیر جانبداری سے عورت کی تصویر کو پیش کیا ہے۔ان کے ناول میں عورت دو طرح سے پیش ہوتی ہے ایک طرف سعدی اور شہزاد کے روپ میں جو عورت کی شوخی اور چنچل پن کو ظاہر کرتی ہیں جبکہ دوسری طرف ان کی بیٹی حاجرہ بیگم اور دوسری بیگم اقبال بیگم۔ جس کی زندگی مشکلوں اور مصیبتوں میں گھری ہوئی ہے۔ ممتاز مفتی نے اپنے ناولوں میں عورت کو مظلوم دکھایا ہے لیکن اس کے پیچھے ان کی سوچ یہ ہے کہ اس حالت کی ذمہ دار وہ خود ہے۔

خدیجہ مستور کے ناول "آنگن" میں عورتوں کی زندگی ان کے مسائل اور ان کی سماجی حیثیت متحدہ ہندوستان کی زوال پذیر معاشرے سے تعلق رکھتی ہے۔انہوں نے ایک خستہ حال زمیندار گھرانے کی معاشرت اور ماحول کے حوالے سے اس طبقے کی عورتوں کے مسائل کو پیش کیا ہے۔اس معاشرے کی عورت گھٹن اور بے بسی کا شکار ہے۔ان کے مطابق اس کے پیچھے ماحول، مذہب اور فرسودہ رسوم و رواج ہیں۔ جہاں عورت کے پاس ماضی کی خوشگوار یادیں، حال کی تلخیاں اور مستقبل کی محرومیاں ہیں۔

نثار عزیز بٹ کے ناول میں عورت کا کردار فعال ہے۔ نثار عزیز بٹ کی عورت ذہنی تجربات کی کئی دنیاؤں سے گزرتی ہے۔ان کے ہاں عورت اذیت سے نہیں ڈرتی جبکہ جمود سے وحشت زدہ ہے کیونکہ زندگی جیئے جانے کے قابل تب ہوتی ہے جب اس میں تحریک ہو۔

انتظار حسین نے اپنے عہد کی تہذیبی، سماجی اور فکری جہات کو تسلسلِ زمان و مکان میں دیکھنے اور فنی گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ ہجرت کا واقعہ ان کا سب سے بڑا تجربہ ہے۔ان کے ناولوں کی فضا مایوسی، گھٹن اور اضمحلال سے لبریز ہے۔انتظار حسین کے ناولوں کی عورت سماجی اعتقادات کو ساتھ لے

کر چلتی ہے۔ نامساعد حالات کا شکار عورت ضعیف الاعتقادی کا شکار ہو جاتی ہے اور ان پڑھ ہونے کی صورت میں وہ دقیانوسی بھی ہو جاتی ہے۔

رضیہ فصیح احمد کے ناولوں میں تو تشکیل معاشرہ کا دوغلہ پن اور سرمایہ دارانہ اور جاگیر دارانہ اقدار و روایات کا استحصالی روپ سامنے آتا ہے۔ رضیہ فصیح احمد خان اس طور پر عورت کے مسائل پر قلم اٹھاتی ہیں۔ ان کی عورت مغرب زدہ ماحول میں رہنے کے باوجود گمراہ نہیں ہے۔ اس میں خیر اور شر کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ یہ عورتیں نہ صرف تعلیم یافتہ اور باشعور ہیں بلکہ جذباتی توازن بھی رکھتی ہیں۔ ان کے ہاں عورت کا اصل جوہر وفا شعاری، ایثار پسندی اور شوہر پرستی کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ دوسری طرف معاشرے میں ایسی خواتین کی بھی کمی نہیں جو بڑے شہروں میں سوسائٹی گرل کہلاتی ہیں۔ تصنع کا خول چڑھا کر بے حیائی اور خود نمائی کرتی ہیں اور تباہی کا باعث بنتی ہیں۔ عورت کی عظمت اور آزادی کا خواب دیکھنے والی جمیلہ ہاشمی کے ناول "تلاشِ بہاراں" کو 1961ء میں آدم جی ادبی ایوارڈ دیا گیا۔ جمیلہ ہاشمی عورت کو جس مقدس بلندی پر لے گئی ہیں وہاں حسن و عشق اور واردات قلبی محض سطحی چیزیں ہیں۔ عورت کا تمام زندگی کسی مرد کی طرف مائل نہ ہونا خلاف فطرت لگتا ہے۔ جنسِ مخالف کی طرف مائل ہونا انسان کی بنیادی جبلت ہے۔ محبت ایسا جذبہ ہے جو دھوکہ کھا کر بھی ختم نہیں ہوتا۔ یہ جذبہ تلاش بہاراں میں ناپید ہے۔ جمیلہ ہاشمی کے ہاں خواتین کے مختلف درجے نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں زیادہ تعداد ایسی ہے جو چپ چاپ ظلم سہتی ہیں۔ ان کے ناول میں بیوہ کو ایک الگ درجہ دیا گیا ہے۔ ہندو معاشرے میں بیوہ کی دردناک زندگی کا نقشہ "ششما" کی صورت میں پیش کیا گیا ہے جس کا قصور یہ ہے کہ اس کا میاں بیمار پڑا اور مر گیا جس کی وجہ سے اسے منحوس سمجھا جانے لگا اور اس کے سائے سے بھی گریز کیا جانے لگا۔ "شوبھا" بھی ایسی عورت ہے جس کی بارات ابھی راستے میں تھی کہ اس کے شوہر کو سانپ نے ڈس لیا اور وہ اپنے سسرال بیوہ بن کر پہنچی۔ اس نے اپنی بیوگی کا انتقام معاشرے

سے یوں لیا کہ بیوہ سے داشتہ اور داشتہ سے لیڈر بن گئی۔یوں یہ حقیقت سامنے آئی کہ ہندو معاشرے میں جنسی کج روی تو برداشت کی جاسکتی ہے لیکن دوسری شادی نہیں۔جمیلہ ہاشمی کی عورت استحصال سے ماورا، مساوی حیثیت کی طلب گار ہے۔

ڈاکٹر انور سجاد نے اپنے ناولوں میں تیسری دنیا کی زندگی کے واقعات اور صورتحال کو پیش کیا ہے۔انور سجاد کے ہاں عورت ایک المیہ کی صورت میں پیش کی گئی ہے۔مرد اپنے گھر کی گھٹن سے چھٹکارا پانے کے لیے باہر سہارا تلاش کرتا ہے۔وہ عورت کے ساتھ گناہ میں برابر شریک ہوتا ہے لیکن سزا صرف عورت کو ملتی ہے۔یہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی کہ ایک عورت کب، کیوں اور کیسے ان حالات تک پہنچتی ہے۔ڈاکٹر انور سجاد عورت کو زمین سے مشابہ قرار دیتے ہیں کیونکہ عورت اور زمین میں کئی قدریں مشترک ہیں۔سب سے بڑی قدر کہ دونوں تخلیق کے عمل سے گزرتی ہیں۔وہ عورت کے کردار کو مرد کی حاکمیت اور جبر سمجھتے ہیں۔عورت کی زمین سے مشابہت مصنف کی منفرد سوچ کی عکاس ہے۔

بانو قدسیہ کا شمار اردو کی معتبر ناول نگار خواتین میں ہوتا ہے۔انہوں نے مہارت اور چابکدستی سے عورت کو اپنی تحریر کا حصہ بنایا ہے۔بانو قدسیہ نے عورت کی ناآسودہ خواہشات سے پردہ اٹھایا ہے۔ان کے ناول میں ایسی لڑکی موجود ہے جو اپنے صاحب دولت باپ کی سرد مہری کا شکار ہو کر کلاس فیلو کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔اسے نہ اپنے جسم کی پرواہ رہتی ہے نہ جان کی۔اس صورت میں اگر کوئی شخص اس کے ساتھ جسمانی تعلقات قائم کر لے تو وہ پس و پیش نہیں کرتی بلکہ اپنے زخموں کو کرید کرید کر عجیب سی خود اذیتی سے ہمکنار ہوتی ہیں۔ان کے ہاں موت کی آرزو شدید ہے۔بانو قدسیہ کو اپنے معاشرے، تہذیب اور گرد و پیش کی زندگی خصوصاً طبقہ نسواں کے مسائل و حالات سے صرف دلچسپی نہیں بلکہ گہری وابستگی

ہے۔اسی لیے وہ اپنے مشاہدے کو کردار، مکالمہ، پلاٹ اور موضوعات کی جزئیات دے کر ناول کی شکل میں پیش کردیتی ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی نے صرف ایک ناول "ایک چادر میلی سی لکھا" اس ناول میں "رانو" نسائی کردار ہے۔رانو عورت کا جو تصور پیش کرتی ہے وہ اپنا سب کچھ سونپ کر بھی اپنے شوہر اور سماج سے کچھ حاصل نہیں کرپاتی۔"ایک چادر میلی سی"ہندوستان کے نچلے طبقے کی عورت کی کہانی ہے۔وہ بلاقصور شوہر سے مار کھا کر لہولہان ہوتی ہے اور پھر معمول کے مطابق گھر کے کام کاج سنبھالنے لگتی ہے۔جب شوہر قتل ہو جاتا ہے تو اس کی زندگی آسان ہونے کے بجائے مزید دشوار ہو جاتی ہے کیونکہ معاشرے میں بیوہ کی زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے۔

بیدی اس ناول میں پورے ہندوستان کے دیہاتی کلچر کے دکھ اور زندگی کی کشمکش کی ترجمانی کرتے ہیں۔بیدی نے ناول میں ہندوستان کی اس ناری کو متعارف کرایا ہے جو نامساعد حالات سے سمجھوتہ کرکے ناگوار حقائق کے تلخ گھونٹ پیتی ہے۔سماج نے اس کے لئے جو حالات پیدا کر رکھے ہیں اور جو معیار رکھا گیا ہے اس میں وہ سمجھوتا اور شکست میں ہی اپنی فتح سمجھتی ہے۔

متذکرہ بالا تمام ناول نگاروں کے ہاں ناولوں میں برصغیر کی عورت کے حوالے سے جو تاثر ابھرتا ہے وہ فکر انگیز ہے۔پچھلی دو دہائیوں سے جو ناول نگار رومانوی،تاریخی،سیاسی،معاشرتی اور گھریلو زندگی پر مشتمل ناول لکھ رہے ہیں ان کے ہاں سماجی مسائل سے زیادہ کہانیاں اہم ہیں۔ان کے ناولوں کی عورت بھی مندرجہ بالا ناولوں کی عورت سے مختلف نہیں۔عورت کا مجموعی تصور وہی ہے جو پیش کیا گیا ہے۔ الطاف فاطمہ،انیس ناگی،واجدہ تبسم،اے آر خاتون،ایم اسلم،رضیہ بٹ اور بشرہ رحمان نے بھی عورت پر متوازن انداز میں لکھا۔"اردو ناول میں تانیثیت" دراصل نسلِ انسانی کے ارتقاء میں عورت کے حالات

کی جانکاری ہے جس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ برصغیر میں مختلف عہدوں میں عورت کی حیثیت کیا تھی اور اسے کس کس نشیب وفراز سے گزرنا پڑا۔

اس ساری تگ و دو کا حاصل یہ ہے کہ اردو ناول کی روایت کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ بیشتر اردو ناولوں میں نہ صرف عورت کے جاندار کردار پیش کیے گئے بلکہ عورت کی تہہ دار شخصیت کی مختلف پرتوں کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔ اس کوشش میں ناول نگار کس حد تک کامیاب ہوئے یہ ایک الگ بحث ہے۔ اب جب کہ ہم اکیسویں صدی میں سانس لے رہے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ آج کا ناول نگار مثبت سوچ اور فکر کے ساتھ عورت کے کردار کو اپنے ناولوں میں پیش کر رہا ہے۔ بیوی، جہیز، وٹہ سٹہ، تعلیم نسواں، معاشرتی فرق، غیرت کے نام پر قتل، یہ وہ مسائل ہیں جن کو آج بھی ناول نگار نئے رنگ سے اپنی تحریروں میں پیش کر رہے ہیں اور یہ سلسلہ جاری و ساری مستقبل میں اپنے امکانات کی تلاش میں ہے۔

3۔ ناول "اندھیرا پگ" میں اجاگر کیے گئے مسائل:

ادیب معاشرے کا حساس دردمند اور دوربین فرد ہوتا ہے۔ اس کا بچپن جس علاقے میں بسر ہوتا ہے یا زندگی کا بیشتر حصہ وہ جس علاقے میں رہتا ہے وہاں کا رہن سہن اور تہذیب وثقافت اس کے لاشعور میں رچ بس جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کی تخلیقات میں کہیں نہ کہیں ان کی جھلک نمایاں ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ادب میں علاقائی اثرات یا مقامیت کا وجود ایسا وصف ہے جو تخلیق کار کے کسی مخصوص علاقے سے وابستہ ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ ذکر ہو رہا ہے راجستھانی تہذیب کے تناظر میں لکھے گئے ثروت خان کے ناول "اندھیرا پگ" کا جو پہلی بار 2005ء میں منظر عام پر آیا۔ ثروت خان نے اس ناول میں راجستھان کی علاقائی معاشرت، رسم ورواج، زندگی کے شب و روز، غربت، عظمت، توہم پرستی، جہالت، زبان، روزمرہ اور کہاوت سب کو قلم بند کیا ہے۔

ثروت خان نے "روپی" کے حوالے سے راجستھانی عورتوں کی زندگی کے المیے کو پیش کیا ہے۔ "روپی" جو ایک قابل اور ذہین لڑکی ہے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے لیکن اس کی راہیں مسدود کر دی جاتی ہیں۔ نہ صرف یہ، بلکہ کم عمری میں ہی اس کی مرضی کے خلاف اس کی شادی کر دی جاتی ہے جہاں وہ چند ماہ کے بعد ہی بیوہ ہو جاتی ہے جس سے اس کی زندگی تاریک ہو جاتی ہے۔ اسے اس علاقے کی رسم کے مطابق کئی مسائل سے جڑی بیوگی کی زندگی جینے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ بیوگی ہندوستانی سماج اور خصوصاً راجستھان میں کس قدر دردناک ہے یہ اقتباسات اسے عیاں کرتا ہے:

> "آتے ہی ڈائن دو مہینے میں میرے بیٹے کو کھا گئی۔ اب اور کھانے کو کیا بچا ہے۔ ابھاگن سے کہا تھا ستی ہو جا۔ نشہ کر کے بیٹھ جاتی چتا میں، ایک ہی بار میں پاپ سے جان چھوٹ جاتی، سیدھے سورگ ملتا۔۔۔ نہیں مانی، ہٹ دھرمی، اب تل تل کر مرتی رہے سارا جیون "(10)

نذیر احمد دہلوی سے لے کر اکیسویں صدی تک سماجی مسائل پر لکھے جا رہے خشک ناولوں کے مقابلے میں یہ ناول قدرے دلچسپ ہے۔ راجستھانی تہذیب کے تناظر میں اختصار و جامعیت کے ساتھ موجودہ عہد کی عورت کی بپتا اس ناول میں بیان کی گئی ہے وہ سب سے زیادہ کرب انگیز اور المناک ہے۔ اس میں عورت کا دکھ ہی دکھ ہے، اداسیاں ہیں، اس کے غموں کی پرچھائیاں ہیں، مگر غم سے نجات کے تمام راستے بند ہیں۔ پورے ناول میں بھول کر بھی دل کا بوجھ کم کرنے کو مصنفہ نے ایک عدد مزاحیہ یا ظرافت کا قصہ نہ لکھ پائیں۔ شہاب ظفر اعظمی "سہ ماہی مباحثہ" میں لکھتے ہیں:

> "واضح ہو کہ یہ ناول محض وقت گزاری کے لیے یا تفنن طبع کے لیے نہیں لکھا گیا۔ اس کا اخلاقی پس منظر اتنا مضبوط، مستحکم اور مربوط ہے کہ مصنفہ کے وجود، ناول کے مقصد اور اس مقصد کے دائرہ کار کو نظر انداز

کر کے اس ناول کی مجموعی قدر و قیمت کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا
جاسکتا۔ ثروت خان کے شعور کی ایک سطح بہت نمایاں ہے اور ناول کی ہر
سطر میں اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہے "(11)

وہ سطح کیا ہے ؟ وہ سطح موجودہ انسانی معاشرے میں عورت کے وجود کی معنویت سے عبارت ہے۔اس کی تقدیر اور گردوپیش کی دنیا میں اپنی شراکت سے متعلق ہے تانیثیت نے اس عہدِ موجود میں ایک اہم معاشرتی قدر کے ساتھ ساتھ وجودی مسئلہ کی حیثیت بھی اختیار کرلی ہے۔

"اندھیرا پگ" میں الم کی ایک مستقل آنچ، اداسی اور ملال کی گہری کیفیت موجود ہے۔ اسی لئے مصنفہ کو کہیں مبالغے سے کام لینا نہیں پڑا۔ یہ کہانی روپی کی نہیں بلکہ ایک عورت کی ہے جو مختلف تہذیبوں کا طویل سفر طے کرنے کے باوجود آج بھی اپنی تہذیبی شناخت کے عمل سے گزر رہی ہے۔

ثروت خان کا نام اکیسویں صدی کے ناول نگاروں میں لیا جاتا ہے۔ "اصلاح النساء*[8]" سے شروع ہونے والی روایت "اندھیرا پگ" تک پہنچتی ہے۔ اردو ناول میں ہمیں مختلف النوع موضوعات نظر آتے ہیں۔ سماج کا ایسا کوئی مسئلہ نہیں جسے ناول نگاروں نے اپنی تحریروں میں پیش نہ کیا ہو۔ جہیز کا مسئلہ ہو یا کثرت ازدواج کا، ستی کا مسئلہ ہو یا کاروکاری کا، کم عمری کی شادی کا ہو یا بیوگی کا، ناول نگار نے ان تمام مسائل کو مختلف علاقوں کی تہذیبوں اور سرزمینوں کا استعمال کرتے ہوئے اسے ہر ممکن طریقے سے اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔

ثروت خان نے بھی اپنے ناول "اندھیرا پگ" میں عورت کے درج ذیل مسائل کو پیش کیا ہے

- تعلیم نسواں

8۔اصلاح النساء*: اردو کی پہلی خاتون ناول نگار رشید النساء کا ناول "اصلاح النساء" جو 1881ء میں منظر عام پر آیا۔
رشید النساء، "اصلاح النساء"، ناشر: نامعلوم، سن، 2000ء

- کم عمری کی شادی
- بیوہ ہو جانا
- توہم پرستی
- عدم مساوات
- صنفی استحصال

ثروت خان کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے باقی قلم کاروں سے ہٹ کر راجستھان کی سرزمین کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس سے پہلے بہت ہی کم ادیبوں نے راجستھان کی عورت کے مسائل کی طرف توجہ کی ہے۔

راجستھان کا گاؤں "دیش نوک" جو آج بھی جہالت کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا ہے یہاں کے لوگ فرسودہ رسم و رواج کے امین بن کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ پروہتوں نے اپنے وراثتی علم کو فروغ دے رکھا ہے جس کا تصور اکیسویں صدی میں محال نظر آتا ہے۔ "دیش نوک" میں یہ سب نسل در نسل منتقل کیا جا رہا ہے۔ نئی نسل کی تعلیم و تربیت پر کسی کا دھیان نہیں ہے۔ اعلیٰ تعلیم اور اچھی تہذیب سے ان کا دور کا واسطہ نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ گاؤں میں صحت کی سہولیات بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اکثر خواتین وضعِ حمل کے وقت ناکافی سہولیات اور ناپختہ کار عملے کی وجہ سے داعی اجل کو لبیک کہہ دیتی ہیں۔ پرانے رواجوں نے خواتین کے ذہنوں کو ناکارہ اور کند بنا دیا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے بارے میں کچھ سوچ نہیں سکتیں۔ اسی وجہ سے اپنے بارے میں، کوئی بھی فیصلہ کرنے کی ان کے اندر صلاحیت ہے نہ حوصلہ۔ سماج کے ٹھیکیداروں کے بنائے سخت قوانین کی بدولت عورتیں غلاموں سے بھی بدتر زندگی جینے پر مجبور ہیں۔

ناول کا مطالعہ قاری کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ آج اکیسویں صدی میں جب کہ انسان چاند پر قدم رکھ چکا ہے، فضا میں راکٹ گردش کر رہے ہیں، نئی نئی تحقیق ہو رہی ہے، وہیں ہندوستان کے ایک شہر میں یہ دقیانوسی چلن عام ہے۔

اکیسویں صدی میں انسان اپنے وجود کی شناخت میں لگا ہوا ہے۔ اس کے چاروں طرف ٹیکنالوجی کے جال بچھے ہوئے ہیں۔ وہاں ایک باپ اپنی بیٹی کو کالج کی تعلیم دلانے سے گریزاں ہے۔ نہ صرف گریزاں بلکہ وہ فوراً اس کی شادی کر دیتا ہے۔ آج کے دور میں اس باپ کے طرزِ عمل کو دیکھ کر ذہن میں ایک ہی سوال اٹھتا ہے کہ:

سماج میں تبدیلی کہاں آئی ہے؟

آج بھی بنیادی مسائل پہلے کی طرح منہ کھولے کھڑے ہیں۔ تہذیب کے اس درخت کے اوپر پھول تو نظر آرہے ہیں لیکن جڑیں کھوکھلی ہیں۔

ناول "اندھیرا پگ" کا مرکزی کردار روپی جو گاؤں کے پنڈت رتن سنگھ کی لاڈلی بیٹی ہے لیکن آگے پڑھنے کی اجازت اسے بھی نہیں۔ روپی کے دل میں پڑھنے اور آگے بڑھنے کی لگن پوشیدہ ہے لیکن اس راہ میں اس کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں۔ روپی اپنے خوابوں کو تعبیر دینا چاہتی ہے، وہ ڈاکٹر بننا چاہتی ہے، لیکن اس کے ماں باپ سماج کے آگے اس قدر بے بس ہیں کہ اس کا ساتھ نہیں دے سکتے اور روپی کو سسٹم کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ مجبوراً روپی کو ڈاکٹر کے بجائے دلھن بننا پڑتا ہے وہ سوچتی ہے:

> "میری زندگی! تو نے مجھے ایسے دوراہے پر لا کر کھڑا کر دیا جہاں سے میں
> اس آزاد پنچھی کی طرح پرواز کرنا چاہتی ہوں جو دور خلاؤں میں بے فکر
> اور دل شاد ہوا کے دوش پر اڑتا چلا جاتا ہے مگر کیا کروں تیری ڈالی ہوئی یہ
> بیڑیاں، یہ سلاسل میری پروازِ فکر پر بھی قدغن لگا دیتے ہیں"(12)

روپی کی یہ حالت دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ آج جب ہم کہتے ہیں کہ ہندوستان کی عورت آزاد ہے جنھیں ہر میدان میں مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کے حقوق حاصل ہیں۔۔۔ کہاں ہے وہ عورت؟ دل میں ایک ٹھیس اٹھتی ہے کہ کہاں ہے وہ آزادی؟ کہاں ہے وہ آزاد ملک؟ یوں تو پوری دنیا میں عورتیں استحصال، جبر اور امتیازی سلوک کا شکار ہیں لیکن راجستھان کی عورت فرسودہ مسائل کا شکار ہے۔ اہم مسائل کی بات کی جائے تو روزگار کے مواقع نہ ہونا، کم اجرت، بلامعاوضہ کام، جنسی اور نفسیاتی طور پر ہراساں کرنا، مارپیٹ، امتیازی قوانین، معاشرتی تعصب، سیاسی عمل میں شمولیت میں رکاوٹیں، تشدد، رسم و رواج کے بندھن، قتل، زنا بالجبر، اغواء گھر اور گھر سے باہر عدم تحفظ، تعلیم کے حصول میں رکاوٹیں، آزادانہ نقل و حمل میں رکاوٹیں، جبری مشقت، زبردستی اور کم عمری کی شادی، غیر معیاری خوراک، نامناسب رہائش۔ ناانصافی، پروفیشن کو چننے میں پابندی، دوسری شادی کو معیوب سمجھنا یہ سب اس زمرے میں آتے ہیں۔ کہنے کو تو ہم اکیسویں صدی میں داخل ہو چکے ہیں لیکن آج بھی غیرت کے نام پر عورت کا قتل ہوتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کی راہیں مسدود کر دی جاتی ہیں۔ بھیڑ بکری کی طرح اسے کسی کے بھی ساتھ اس کی مرضی کے بغیر منسوب کر دیا جاتا ہے۔ اس کا شوہر وفات پا جاتا ہے تو یہ جرم بھی اس کے کھاتے میں لکھ دیا جاتا ہے اور اسے منحوس قرار دے دیا جاتا ہے۔ کھانے پینے، ہنسنے بولنے پر پابندی اور پہننے اوڑھنے میں بدرنگ لباس پر زور دیا جاتا ہے۔ دوسری شادی معیوب سمجھی جاتی ہے۔ عورتوں کو قانونی حقوق حاصل نہیں کہ وہ اپنی زندگی کو سنوارنے کے لیے کچھ کر سکیں۔ قدم قدم پر رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عورت کی پہلی مخالفت اس کے گھر سے ہی شروع ہوتی ہے۔ اکثر عورتیں تو اپنی جاہلیت کے سبب اپنے حقوق تک سے ناواقف ہیں۔ قبائلی اور جاگیردارانہ رسوم ورواج عورت کی آزادی میں رکاوٹ ہیں۔ مذہب کو عورت کے استحصال اور جبر کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ زبردستی کی شادی، کم عمری کی شادی کے لئے انسانی حقوق کو سامنے رکھتے ہوئے فوری منصفانہ فیصلوں کی ضرورت ہے تاکہ اس بربریت کے سلسلے کو روکا جا سکے۔ عورت کی شرحِ خواندگی کو بڑھانے کے لیے بھی خصوصی اقدامات کرنے کی

ضرورت ہے۔ قدامت پسند معاشروں میں عورت کا مصرف سجنا، سنورنا، بچے پیدا کرنا اور تمام عمر گھر کے کاموں میں مصروف رہنا سمجھا جاتا ہے۔ یہی نہیں اسے زندگی کے سنجیدہ سماجی، معاشی اور معاشرتی معاملات سے بھی شعوری طور پر دور رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ عورت کو ہر جگہ جنسی تفریق کا سامنا ہوتا ہے۔ سماج میں موجود مردوں کی حاکمیت ذہنی تناؤ کا سبب بنتی ہے۔ جنسی زیادتی اور اجتماعی زیادتی جیسے واقعات معمول کا حصہ ہیں۔ ناول "اندھیرا پگ" میں بھی روپی پر نہ صرف اعلیٰ تعلیم کے دروازے بند کیے جاتے ہیں بلکہ اس کی زور زبردستی سے شادی کر دی جاتی ہے اور جب اس کا شوہر دو ماہ کے بعد مر جاتا ہے تو روپی کی زندگی تہہ و بالا ہو جاتی ہے۔ روپی کی زندگی میں اچانک نہ ختم ہونے والا اندھیرا چھا جاتا ہے۔ حویلی کے تنگ و تاریک سیلن زدہ کمرے میں اسے سر منڈوا کر، بدرنگ لباس پہنا کر، روکھا سوکھا کھانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ تاکہ اس کا نفس اسے پھر سے زندگی کی رنگینیوں کی طرف نہ لے جائے۔ اس کی ساس اسے بار بار طعنہ دیتی ہے کہ تم نے خود اس زندگی کو چنا ہے تمہیں چاہئے تھا کہ شوہر کی چِتا کے ساتھ ستی ہو جاتی۔ عورت بیوہ نہ ہوئی اچھوت کی بیماری ہو گئی کہ اس کے ساتھ کھانا پینا ہنسنا بولنا برا سمجھا جانے لگا۔ چرند پرند کو بھی اس کے سائے سے دور رکھا جاتا کہ یہ منحوس ہے۔ ڈیڑھ ماہ کے بعد اماوَس کی رات کال کوٹھڑی سے اس عورت کو باہر نکالا جاتا ہے تاکہ اندھیرا ہو اور اس کا منحوس سایہ کسی جاندار شے پر نہ پڑے۔

اس سفر کو ہی "اندھیرا پگ" کا نام دیا گیا ہے جو اس ناول کا موضوع ہے۔ روپی اندھیرا پگ کی رسم کے بعد جب گھر آتی ہے تو اسے لگتا ہے کہ شاید اذیت بھری زندگی سے اسے نجات مل گئی ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا اس کی وجہ یہ تھی کہ روپی صرف میکے سے سسرال گئی تھی۔ معاشرے کے بنائے ہوئے رسم اور رواج میں تو کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اس کے والدین بھی اسی بدبودار سماج کا حصہ تھے جس کی بھینٹ عورت ہمیشہ سے چڑھتی آئی ہے۔

روپی کی حالت دیکھ کر اس کی خادمہ کو افسوس ہوتا ہے اور وہ اس کو دیکھ کر سوچتی ہے کہ:

"بھگوان کسی کو ودھوانہ کرے، یوں روز مرنے سے تو اچھا ہے کہ وہ
ودھوا ستی ہو جائے تو ایک بار میں پاپ کٹے "(13)

ثروت خان نے بیوہ کے مسائل کو بڑی باریک بینی سے بیان کیا ہے۔ وہ اپنے مرکزی کردار روپ کنور عرف روپی کے ذریعے بتاتی ہیں کہ بیوہ ہونے کے بعد روپی اپنی زندگی میں آئی تبدیلی کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ اسے سمجھ نہیں آتا اس کے ساتھ جو ناانصافی ہو رہی ہے اس میں اس کا کیا قصور ہے۔ سماج اس پر ظلم کیوں ڈھا رہا ہے۔ یہ سوال اس کے ذہن کی سطح پر بار بار ابھرتے ہیں۔

روپ کنور کی پھوپھی راج کنور روپی کی بیماری کا بہانہ بنا کر اسے ساتھ شہر لے جاتی ہے۔ وہ اپنے مردہ خوابوں کا عکس روپی میں دیکھتی ہے اور اسے مناسب تیاری کے ساتھ امتحان دلوا کر میڈیکل میں داخلہ دلوا دیتی ہے جہاں روپی ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے لگتی ہے۔ لیکن بد قسمتی یہاں ابھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ روپی کی تعلیم کی خبر گاؤں والوں کو مل جاتی ہے۔ گاؤں والے اس بات پر بضد ہو جاتے ہیں کہ روپی کو واپس گاؤں بلایا جائے۔ اس وقت تک روپی میں کافی تبدیلیاں آچکی ہوتی ہیں۔ وہ اپنے اندر زمانے کے دستور کے خلاف آواز بلند کرنے کی ہمت پیدا کر چکی ہوتی ہے۔ وہ غلط بات بلا جھجھک کہہ ڈالتی ہے۔ وہ باپ سے پوچھتی ہے کہ آخر ہم کب تک اس نظام کی بھینٹ چڑھتے رہیں گے۔ کب تک اس فرسودہ نظام کے غلام بنے رہیں گے۔ روپی زمانے سے لڑنے کا عزم رکھتی ہے۔ روپی کی دادی بھی اس ماحول کی پیداوار ہے اور اس کے ذہن میں روایتی عورت کا تصور ہے تبھی وہ اپنی بیوہ پوتی کی حمایت کرتی ہوئی اپنی بیٹی اور بہو کو ڈانٹتے ہوئے کہتی ہے:

"تو نند بھاوج کا دودھ دماغ خراب ہو گیا ہے۔ استری، استری۔۔۔۔رٹ
لگا رکھی ہے۔ کیا ہے یہ کون ہے۔ یہاں استری کا مسلہ ہے نہ پرش کا۔
سارا کھیل سماج کے نیموں کا ہے "(14)

ثروت خان کے ناول "اندھیرا پگ" کا کینوس چھوٹا ہے لیکن ان کا فکری کینوس بڑا ہے۔ وہ صدیوں سے رسم و رواج کے پاٹوں میں پس رہی عورت کے مصائب بیان کرتی ہیں۔ روپ کنور کا والد پنڈت رتن سنگھ ہے۔ راجستھان اور ہندوستان کے دیہاتی علاقوں میں آج نہیں شروع سے مذہبی مقامات ایسے اداروں کا درجہ رکھتے ہیں جن میں عام انسانوں میں اپنی ضعیف الاعتقادی کے ساتھ خواہشوں اور خوابوں کی تکمیل اور مصائب و مشکلات سے نجات کا در کھلتا ہے۔

یہ بحث بیکار ہے کہ ایسا کرنا صحیح ہے یا غلط لیکن ان اداروں سے تسکین اور مسرت حاصل ہوتی ہے۔ برصغیر کی مٹی میں ایک ایسی غیر مرئی شخصیت کا انتظار شامل ہے جو ہماری آرزوؤں کو پورا کرے۔ یہ یہاں کے قدیم رسم و رواج اور مخصوص تعلیمات کا حصہ ہے۔ تقسیم کے وقت کیا کیا آدرش دیے گئے تھے لیکن آج بھی طبقاتی فرق، جاگیردرانہ لوٹ کھسوٹ، سیاست، منافقت، ریاکاری کا عروج، منہ سے جہیز مانگنے کا رواج، دوسری شادی کرنا معیوب جیسے مسائل حل طلب ہیں اور ویسے کے ویسے ہی معاشرے میں موجود ہیں۔ ثروت خان ناول "اندھیرا پگ" کے دوسرے ایڈیشن کے مقدمے "مجھے گفتگو جن سے ہے" میں کہتی ہیں:

> "حقیقت بھی یہی کہتی ہے کہ جد و جہد، حاصل اور لاحاصل کے بھنور میں پھنسی نسوانیت کی پکار اپنے وجود، اپنی شناخت اور اپنے شعور و ادراک کا احساس کراتی اگر گونج میں تبدیل نہ ہوئی تو لاتعداد "اندھیرا پگ" لکھے جاتے رہیں گے "(15)

حرفِ آخر یہ ہے کہ اندھیرا پگ عورت کی پوزیشن، اس کے استحصال اور پدرانہ نظام معاشرت کے جبر کا بیانہ ہے۔ یہ موضوع نیا نہیں لیکن اسے جس تہذیب میں برتا گیا ہے وہ نئی ہے۔ اس میں پیش

کیے گئے حقائق اسے اہم بناتے ہیں۔ ہماری نظروں سے او جھل جس تہذیب کلچر اور نظام کو سرسری نظر سے دکھایا جاتا ہے۔ وہ نظام اور کلچر مصنفہ نے بہت باریک بینی سے پیش کیا جو اسے معتبر بناتا ہے۔

حوالہ جات

1- فہمیدہ کبیر، "اردو ناول میں عورت کا تصور"، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1996ء, ص:7

2- مشتاق احمد وانی ،ڈاکٹر،" اردو ادب میں تانیثیت "،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ،دہلی ،2013ء ، ص:27

3- مشتاق احمد وانی ،ڈاکٹر ،"اردوادب میں تانیثیت "، ایجو کیشنل پبلشنگ ہاؤس ،دہلی ،2013ء، ص:28

4- شمیم نکہت،ڈاکٹر،"پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار"،اردو اکیڈمی لکھنؤ،1975, ص:19

5- شمیم نکہت،"پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار اردو اکیڈمی لکھنؤ،1975ء، ص:19

6- مہ جبیں نجم،ڈاکٹر،"کرشن چندر کی ناول نگاری اور نسائی کردار" غالب اکیڈمی،دہلی،2008ء، "، ص:48

7- مہ جبیں نجم،ڈاکٹر،"کرشن چندر کی ناول نگاری اور نسائی کردار"، غالب اکیڈمی دہلی،2008ء، ص:50

8- فہمیدہ کبیر، "اردو ناول میں عورت کا تصور"، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،1996ء، ص:9

9- حیات افتخار ،ڈاکٹر ،"اردو ناول میں ترقی پسند عناصر "، نسیم بک ڈپو ،دہلی ،1988ء، بار اول ، ص:218

10- ثروت خان، "اندھیرا پگ (ناول)"معیار پبلی کیشنز، دہلی، 2005ء، ص:50

11- شہاب ظفر اعظمی، "ثروت خان کا ناول "اندھیرا پگ "ایک مطالعہ "، مشمولہ: مباحثہ (سہ ماہی) جلد 4، جنوری تا مارچ، 2007ء، شمارہ 27، ص: 87

12- ثروت خان, اندھیرا پگ (ناول)"، معیار پبلی کیشنز، دہلی، باراول، 2005، ص: 44

13- محولہ بالا، ص: 69

14- محولہ بالا، ص: 124

15- ثروت خان, اندھیرا پگ (ناول)"، ایجو کیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، باردوم، 2015ء، ص: 7

باب پنجم

محاکمہ

اردو ناول نے اپنی مختصر تاریخ میں متعدد مراحل طے کیے ہیں ۔مولوی نذیر احمد کا اصلاحی ناول متحدہ ہندوستان کے مسلم سماج کی مذہبی شناخت کی بحالی تھا ۔وہ کمزور آدمی کی طرح ہر معاشرتی تغیّر کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کے نزدیک ابن الوقت معیوب تھا لیکن سچ یہ ہے کہ اس زمانے میں اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ جس مسلمان لڑکی کو وہ سینا پرونا اور ادب و آداب میں ماہر بنانا چاہتے تھے اسے وہ آج دفتروں اور فیکٹریوں میں خوار ہوتے دیکھتے تو نہ جانے ان پر کیا بیتتی۔

روح کی تہذیب کے لیے اگر مذہب ناگزیر ہے تو بدن کی تہذیب کے لیے معاشی آسودگی لازم ہے، بہر حال وہ اپنی تمام تر نیک نیتی کے باوجود نمو پذیر تبدیلیوں کا سد باب نہ کر سکے۔ تہذیب فرد کی بجائے معاشرے سے سروکار رکھتی ہے۔ یہ اعزاز مرزا ہادی رسوا کے حصے میں آیا۔ سرشار کے ناول میں تہذیب کے رنگ بڑے شوخ تھے لیکن "فسانہ آزاد کے ذریعے وہ لکھنوی تہذیب کی کوئی کامل صورت قاری کے سامنے نہ لا سکے۔ طوائف کا نگار خانہ ایک روزنِ تہذیب تھا۔ یہ اس عہد کا عمومی طرزِ حیات تھا۔اس عہد کا لکھنؤ مہذب اور متمدن تھا۔ بیسویں صدی کا آغاز برصغیر میں مغربی انداز فکر اور جدید تعلیم کے فروغ کا زمانہ ہے۔ مغرب اور مشرق گلے مل رہے تھے۔اس عہد کے ہندوستان کا ہر فرد غلامی کے شدید احساس اور اس سے بے زاری کی بدولت باہر کی دنیا سے آشنا ہو رہا تھا۔ کسان اور مزدور کا معاشی اور عورت کا صنفی استحصال اب واضح طور پر نظر آنے لگا تھا۔ جدید نفسیاتی شعور عورت سے متعلق مشرق کے قدیم رویوں پر اثرانداز ہوا۔ اس عہد کے جدید شعراء اور ادباء کے ہاں عورت دیوی اور داشتہ کے روپ

سے نکل کر پہلی مرتبہ اپنے عام روپ میں نظر آئی۔ اردو ادب میں پڑھی لکھی عورت کا تصور بیسویں صدی کے آغاز سے پہلے نہیں ملتا۔

ہر ناول نگار کا عورت کے بارے میں اپنا ایک مخصوص اندازِ فکر ہے جس کی بنا پر عورت کے متنوع پیکر سامنے آتے ہیں۔ عورت کی حقیقت جاننے کے لیے اسے تہذیبی تناظر میں دیکھنا ضروری امر ہے جس کے لیے قدیم تہذیبوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ عورتیں روزِ اول سے ہی افراط و تفریط کا شکار رہیں۔ کبھی دیوی تو کبھی طوائف، کبھی ماں، بہن، بیٹی تو کبھی کنیز اور لونڈی۔ عورت کا ان تمام حیثیتوں کے ساتھ استحصال کیا جاتا رہا اور ظلم و جبر کا شکار ہو کر اسے نفرت و حقارت کا نشانہ بننا پڑا۔ عورت مختلف تہذیبوں اور معاشروں کا سفر کرتے ہوئے آج بھی اپنی بقا کے لئے جدوجہد کر رہی ہے۔ اس جدوجہد کو اپنی نوکِ قلم سے صفحۂ قرطاس پر اتارنے والوں میں ایک ثروت خان ہیں جنھوں نے ناول "اندھیرا پگ" لکھا ہے ۔

اندھیرا پگ ہندوستانی سماج میں ایک رسم کا نام ہے۔ جب کوئی لڑکی بیوہ ہو جاتی ہے تو اسے سب سے الگ ایک کوٹھری میں بند کر دیا جاتا ہے۔ کھانے پینے کو ناکافی اور پہننے کو پھٹے پرانے کپڑے دیے جاتے ہیں۔ اس کے ایک ایک عمل پر نگاہ رکھی جاتی ہے۔ زندگی کی رعنائیوں سے دور رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ لڑکی میں تمنا یا خوابوں کا ظہور نہ ہو سکے۔ ڈیڑھ مہینے کے بعد اماوَس کی رات اسے اس کوٹھڑی سے باہر نکال کر میکے والوں کے حوالے کیا جاتا ہے۔ شوہر کی وفات سے یہاں تک کا سفر اندھیرا پگ کہلاتا ہے۔ سچ پوچھیں تو ایک عورت کی ساری زندگی ہی دراصل اندھیرا پگ ہے۔ اسے سماجی مسائل کا سامنا کرتے ہوئے قدم قدم پر اندھیرا پگ سے گزرنا پڑتا ہے۔

"اندھیرا پگ" سے پہلے ثروت خان کے افسانے آچکے تھے۔ 2005ء میں آنے والا "اندھیرا پگ" ان کا پہلا ناول ہے جو ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ ناول سماج میں بیوہ عورت

کے دکھوں کی داستان ہے جو بعد میں تانیثی بغاوت میں بدل جاتی ہے۔ راجستھان کے پنڈتوں، پروہتوں کی حویلیوں کا منظر فوجیوں کے کیمپوں کی یاد دلاتا ہے۔ اس ناول میں ماڈرن ازم اور قدامت پرستی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ جو باتیں گئے گزرے زمانوں کی لگتی ہیں دراصل وہ آج بھی ہمارے آس پاس موجود ہیں۔ عورت کے سماجی مسائل کے ساتھ ساتھ "اندھیرا پگ" راجستھانی سیاست کا تہذیبی و ثقافتی مطالعہ بھی ہے۔ ناول خارجی اور داخلی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے اگر کسی ناول میں تہذیب و ثقافت اور فرد کی ترجمانی نہ ہو تو اس تحریر کی عظمت اور حیثیت کم رہ جاتی ہے۔ کہانی کار اپنے اسلوب سے کہانی کہتا ہے۔ قلم سے جڑے لوگوں کی عقیدت، روحانیت، محبت اور طمانیت کے بیانیے عام لوگوں سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ سوچ کا ارتقاء دراصل فکرِ تہذیب کا ارتقاء ہے اور فکرِ تہذیب کا ارتقاء زندگی کا ارتقاء ہے۔

ثروت خان ہندوستان میں اردو ادب کے افق پر روشن ستارہ ہیں جنھوں نے راجستھان کی سرزمین پر آنکھ کھولی۔ زندگی کی کٹھنائیوں سے مزاج آشنائی کی اور ہر معاملے پر حالات کو بنظرِ غائر دیکھا۔ اپنے علاقے کی تہذیب ، تمدن اور ثقافت کے گہرے مسائل کے بعد انہوں نے عورت کے مسائل، اس کے احتجاج، اور پھر بغاوت کو اپنا موضوع بنایا۔ ادبی حلقوں نے اس ناول کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ روپ کنور عرف روپی دھرتی سے جڑی ایک عورت ہے جسے اپنے علاقے کی پہچان بننا ہے۔

ناول ایسی صنف ہے جس میں انسانوں کی زندگی، ان کے غم، ان کے رسم و رواج، ان کی تہذیب و ثقافت تخلیقی انداز میں ناول نگار اپنی تحریر میں پیش کرتا ہے۔ ناول نگار کی تحریر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مذکورہ تہذیب و ثقافت اس نے کہیں نہ کہیں ضرور چھوا ہے۔ جیسا کہ نذیر احمد دہلوی کا ناول "مراۃالعروس" اصلاحی رنگ کے باوجود سماج کا عکاس ہے۔ مرزا ہادی رسوّا کا "امراؤ جان ادا" لکھنوی تہذیب کا ترجمان ہے۔ طاہرہ اقبال کا "نیلی بار" باروں کی سرزمین کا علمبردار ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی اور مستنصر حسین کے "بہاؤ" میں بھی تہذیبیں جلوہ گر ہیں۔ ترنم ریاض کے ناول "برف آشنا پرندے"

میں کشمیر کا کلچر اور اہم کشمیری خاندان کے تہذیبی ارتقاء اور زوال کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ بلاشبہ انسان اپنی دھرتی سے جڑا ہونے کے باعث اس سے متاثر ہوتا ہے۔ وہاں کی خوشیاں، وہاں کے غم، وہاں کے موسم، وہاں کے مناظر، وہاں کی زبان، وہاں کی تہذیب اور وہاں کے سماجی و معاشرتی مسائل کبھی چاہ کر اور کبھی نہ چاہ کر بھی اس کی تحریروں سے جھلکتے ہیں۔

کہانی لکھنے کے لیے مشاہدہ ضروری ہے مطالعہ کی یہ طلسمی خاصیت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ جتنا زیادہ مطالعہ کیا جاتا ہے اتنے ہی زیادہ الفاظ اور زندگی کے نئے زاویے کھل کر سامنے آتے ہیں۔ ہم سبھی اپنی زندگیاں جیتے ہیں لیکن کہانی قصے ہمیں زندگی کے منفرد آہنگ سے ہمکنار کرتے ہیں۔ مصنفہ ناول کے مقدمے میں خود کہتی ہیں کہ اس ناول کو تحریری شکل دینے سے پہلے میں جیسلمیر گئی۔ وہاں کے کلچر، تہذیبی اقدار اور ثقافتی نظام سے متاثر ہوئی، بیکانیر گئی، جودھ پور گئی ،وہاں کا رہن سہن، سماجی و تہذیبی امور، رسم و رواج اور اصولوں کی پاسداری میں کوشاں افراد کو اپنے ارد گرد دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ کہتی ہیں ہندوستانی تہذیب و کلچر کی دہائی دیتا یہ نظام جس کو بدلنے کی آپ کوشش کریں گے تو آپ کے سینکڑوں مخالف آس پاس سے پیدا ہو جائیں گے۔

وہ کہتی ہیں کہ آنے والے کئی سو سال تک اس سراب کو حاصل کرنے کی خواہش میں آپ اپنے آپ کو صرف کرتے چلے جائیں گے۔ بس یہی ہمارا آج ہے اور کل بھی تھا اور کل بھی ہوگا۔ وہ کہتی ہیں کہ راجستھان رنگ رنگیلی تہذیب کا مرکز کہلاتا ہے لیکن اس کے دیہات کو دیکھیں تو سسکتے رواجوں اور وراثتوں کو گلے لگاتی سفاک حقیقتوں سے پالا پڑتا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ میں نے راجستھان اور اس کی تہذیب کو قریب سے ،اندر سے دکھانے کی ادنی سی کوشش کی ہے ۔

اکیسویں صدی میں چھپنے والے ناولوں میں "اندھیرا پگ" خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہ راجستھانی تہذیب اور تاریخ پر لکھا ہوا شاہکار ناول ہے۔ اس کے اندر تاریخی اور تہذیبی معلومات کا ذخیرہ

ہے۔ ثروت خان جو کہ اس علاقے کی باسی ہیں اس لئے اس کی تہذیبی پس منظر سے اچھی طرح آگاہ ہیں انہوں نے اپنے کرداروں کو اسی ماحول اور ثقافت میں برتا اور لکھا ہے۔ ناول پڑھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ مصنفہ کا بس نہیں چلتا کہ وہ کس طرح جادو کی چھڑی سے اس منظر نامہ کو تبدیل کر دیں۔ عورت کی بے بسی کا انہوں نے مکمل نقشہ کھینچا ہے ۔ وہ بیوہ روپی ہو، ایک بیوہ عورت کی ماں سبھدرا ہو، نوکرانی رونی ہو یا بیوہ پوتی کی دادی جو کہتی ہے کہ جوان پوتی بیوہ ہو جائے تو نوالہ کیسے حلق سے اترتا ہے۔

یہ ناول تاریخ میں نئے سفر کی نوید سناتا ہے۔ مہذب اور ترقی یافتہ قومیں وقت کے ساتھ بدلاؤ اور مرحلہ وار مٹتی ہوئی تہذیب اور ثقافتی رسم و رواج کو اپنی تحریروں میں محفوظ کر لیتی ہیں۔ یہی کام ثروت خان نے کیا ہے۔ عورت کے مسائل کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ راجستھانی تہذیب تک آج کے قاری کی رسائی میں ہے۔

ثروت خان یہ بتانے کی کوشش کر رہی ہیں کہ کس طرح اربابِ اختیار نے اس علاقے کی اہمیت کو نظر انداز کیا ہے حالانکہ اس علاقے کی تاریخ قدیم ترین ہے۔ مصنفہ نے راجستھانی ماحول کی گہرائی میں اتر کر زندگی کے نقوش کو ابھارا اور اس تہذیب کے انمٹ نقوش کو واضح کیا ہے۔ ان کا تعلق اسی تہذیب سے ہے لہٰذا مٹی کی محبت ان کے بدن میں خون بن کر دوڑ رہی ہے۔ وہ خود ایک عورت ہیں اس لئے انہوں نے عورت کے درد کو قریب سے دیکھا اور سمجھا ہے۔

ثروت خان "اندھیرا پگ" میں کہانی سے ہم آہنگ علاقائی زبان اور لب و لہجے کا استعمال کیا ہے۔ مقامی زبانوں سے انہوں نے الفاظ و تراکیب ، روزمرہ، محاورات، ضرب الامثال ، تشبیہات اور استعارے لیے ہیں ۔ زبان و بیان پر ان کی گرفت مضبوط ہے۔ انہوں نے نہ صرف اردو زبان میں قدیم سنسکرتی الفاظ شامل کر کے اس کے ذخیرہ الفاظ کو وسعت دی ہے بلکہ آہستہ آہستہ ختم ہوتی زبان کو بھی پھر

سے زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کے مکالمے جاندار ہیں موقع محل کے اعتبار سے طویل اور مختصر مکالمہ فکر اور جذبے میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ "اندھیرا یگ" کم کرداروں کے ساتھ ایک بڑی کہانی ہے کرداروں کی تشکیل و تعمیر میں ثروت خان کا فن عروج پر ہے۔ان کے کردار معاشرے سے تعلق رکھنے والے عام انسان ہیں جو جذبات سے گندھے اور احساس سے مرتب ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرتی بے عملیوں کا شکار بھی ہیں۔ان کا ہر کردار اپنی جگہ مکمل اور بھرپور ہے۔ثروت خان نے بیانیہ تکنیک سے کام لیا ہے۔

انہوں نے اپنے عمیق مطالعے سے یہ ثابت کیا ہے کہ راجستھان برصغیر کی تاریخ کا ایک باب نہیں بلکہ خود ایک تاریخ ہے جو حال سے گزرتے ہوئے روشن مستقبل کی تلاش میں ہے۔ثروت خان نے اپنے قلم کی تاب دے کر راجستھانی کلچر کو چمکایا ہے۔ثروت خان نے روپی کی صاف اور سچی کہانی لکھی ہے اور اپنے قلم کو کسی مخفی خواہش یا سیاسی آلودگی سے مجروح نہیں کیا۔ مصنفہ نے کرداروں کی نفسیاتی تحلیل چابکدستی سے کی ہے۔ناول میں جو بات سب سے عجیب محسوس ہوتی ہے وہ روپ کنور کا اچانک بیوہ ہو جانا ہے کیونکہ کہیں بھی اس کے شریک حیات کی وفات نہیں دکھائی گئی۔ناول کو جلدی جلدی ختم کرنے کی شعوری کوشش محسوس ہوتی ہے۔

ناول میں جابجا متروک، مفرس اور سنسکرتی الفاظ فراوانی سے استعمال کیے گئے ہیں جس کے لیے بے اختیار قاری کو لغت دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔کئی مقامات پر خود کلامی قاری پر گراں گزرتی ہے۔ناول علاقائی تہذیب و تمدن اور تاریخ کا احاطہ کرتا ہے لیکن خشک ہے۔ناول کے نام سے ہی مایوسی ٹپکتی ہے۔عام کہانیوں کی طرح ناول کا انجام خوش کن ہے جو مصنوعی سا لگتا ہے۔ناول کا انجام روایتی اور پرانی فلموں سے ملتا جلتا ہے جن میں بھرپور کشمکش کے بعد سب کچھ بالآخر ٹھیک ہو جاتا ہے۔

نتائج:

زیرِ نظر مقالہ ثروت خان کے ناول "اندھیرا پگ" میں راجستھانی تہذیب اور عورت کے مسائل کے حوالے سے پیش کیا گیا۔ اسے 2005ء میں معیار پبلی کشنز دہلی اور 2015ء میں ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی نے شائع کیا۔ اس ناول میں راجستھانی تہذیب کا تذکرہ صراحت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ناول میں راجستھان کی تاریخ، تہذیب، معاشرت، سماج، مذہب اور ثقافتی عناصر کو پیش کیا گیا ہے۔ ثروت خان نے جن مسائل اور موضوعات کو ناول میں پیش کیا ہے وہ ہر گز بھی نئے نہیں ہیں لیکن انہوں نے اپنے اندازِ نگارش سے جدت اور ندرت پیدا کی ہے۔ انہوں نے اس علاقے کے رسوم، عادات، موسموں، توہمات اور زبان کو آنے والی نسل کے لئے محفوظ کر دیا ہے۔ ثروت خان ایک حقیقت نگار کے طور پر سامنے آئی ہیں جنہوں نے اپنے قلم کو معاشرتی جراحی کے لیے استعمال کیا ہے۔ ناول کا اسلوب، کرداروں کی تشکیل اور منظر کشی نہ صرف ناول نگاری کے فن پر پورا اترتے ہیں بلکہ مصنفہ کے فن کا منہ بولتا ثبوت بھی ہیں۔

تجاویز :

1- راجستھان کی تہذیب و ثقافت پہ الگ سے مقالہ لکھا جانا چاہیے۔

2- "اندھیرا پگ" میں راجستھانی تہذیب کی بات کی گئی ہے اس کے علاوہ مصنفہ کے اسلوب، لفظیات اور معنویات پر بھی مقالہ لکھا جانا چاہیے۔

3- مصنفہ کے احوال و آثار پر بھی الگ سے تحقیقی کام ہونا چاہیے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:

- ثروت خان، اندھیرا پگ، معیار پبلی کیشنز، دہلی، 2005 ء

ثانوی ماخذ :

- احسن فاروقی، ناول کیا ہے، دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ۔ س۔ن،
- ای ایم فاسٹر، "ناول کا فن، (ترجمہ: ابو الکلام قاسمی)" ،ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، 1992ء۔
- ای ایم فاسٹر، "ناول کیا ہے، (ترجمہ: احسن فاروقی)"، دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ۔ س۔ن۔
- ایس۔ایم ایڈورڈ، "مغلوں کا دور حکومت اور ان کا زوال (مترجم: محمد زاہد ملک)"، مشتاق بک کارنر، س۔ن۔ :
- جمیل جالبی، ڈاکٹر، "آرٹ اور کلچر"، رال بک کمپنی، کراچی، 1992 ء۔
- جمیل جالبی، ڈاکٹر، " قومی انگریزی اردو لغت"، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، طبع اوّل، 1996ء۔
- حیات افتخار، ڈاکٹر، "اردو ناولوں میں ترقی پسند عناصر"، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، 1988ء۔
- خالد اشرف، ڈاکٹر، "برصغیر میں اردو ناول"، فکشن ہاؤس، لاہور، 2005 ء۔

- رشید احمد گوریجہ ،ڈاکٹر،اردو میں تاریخی ناول،البلاغ،س۔ن۔
- سبطِ حسن، "پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء"،دانیال، کراچی،اشاعت ہشتم،1989ء۔
- سہیل بخاری، ڈاکٹر، ناول نگاری (اردو ناول کی تاریخ و تنقید) مکتبہ میری لائبریری، لاہور، 1966 ء۔
- شمس القمر،ہاشمی،"روداد برصغیر"، علی فرید پرنٹرز،لاہور،اشاعت،2010 ء۔
- شہاب ظفر،اعظمی،ڈاکٹر،"اردو ناول کے اسالیب"، تخلیق کار پبلشرز،پٹنہ،2005 ء۔
- شہزاد منظر،"پاکستان میں اردو ادب کی صورتحال"(مرتبہ)ڈاکٹر اسد فیض ،پورب اکادمی، اسلام آباد،2014ء۔
- طاہرہ اقبال،"نیلی بار"،دوست پبلی کیشنز،اسلام آباد،2017 ء۔
- عامر سہیل، ڈاکٹر، " جدید لسانیاتی اور اسلوبیاتی تصورات "،مثال پبلشرز، فیصل آباد، 2021ء۔
- عبدالسلام،ڈاکٹر، "فنِ ناول نگاری"،اردو اکیڈمی سندھ،پہلا ایڈیشن،1999 ء۔
- عبداللہ سیّد، ڈاکٹر، "کلچر کا مسئلہ "،شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز ،لاہور، اشاعت اوّل، 1977ء۔
- عثمان فاروق،ڈاکٹر،"اردو ناول میں مسلم ثقافت"،بیکن بکس،ملتان،2002 ء۔
- عظیم الشان، صدیقی،"اردو ناول کا آغاز وارتقاء"، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،2008ء۔
- علی عباس جلال پوری،سید،"روایت تمدّنِ ہند"اشاعت، جہلم،1991 ء۔
- علی عباس حسینی،"ناول کی تاریخ اور تنقید"،لاہور اکیڈمی۔لاہور۔1924ء۔
- غفور احمد،"نئی صدی نئے ناول"،کتاب سرائے اردو،لاہور،2014 ء۔
- محمد ادریس، صدیقی،"وادی سندھ کی قدیم تہذیب"فکشن ہاؤس مزنگ روڈ لاہور،2003 ء۔

- محمد افضال بٹ،ڈاکٹر،"اردو ناول میں سماجی شعور"،پورب اکادمی،اسلام آباد،2009ء۔
- محمد قاسم فرشتہ ،"تاریخِ فرشتہ (ترجمہ: مولانا فدا علی طالب)"،جلد سوم ،اسلامی کتب خانہ، لاہور۔
- محمد نعیم ورک،"اردو ناول کا ثقافتی مطالعہ"،کتاب محل داتادر بار مارکیٹ،لاہور،2019 ء۔
- ممتاز احمد خان،ڈاکٹر،"اردو ناول کے چند اہم زاویے"،انجمن ترقی اردو کراچی،2003 ء۔
- ممتاز احمد خان،ڈاکٹر،"اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار"،فکشن ہاؤس لاہور،2012 ء۔
- ممتاز احمد خان،ڈاکٹر،"ناول کے بدلتے تناظر"،ویلکم بک پورٹ،کراچی،بار اوّل،1993ء۔
- ممتاز شیریں، "تکنیک کا تنوع ناول اور افسانے میں"، اردو رائٹرز گلد، الہ آباد، (انڈیا)، 1997ء۔
- ممتاز شیریں،معیار،نیاادارہ،لاہور،1963ء۔
- ناہید قمر،ڈاکٹر،"اردو ادب میں تاریخیت"،پورب اکیڈمی،اسلام آباد،2017ء۔
- نعیم مظہر،ڈاکٹر/فوزیہ اسلم،ڈاکٹر(مرتبین)،"اردو ناول تفہیم و تنقید)،ادارہ فروغ قومی زبان، پاکستان،2012ء۔
- ول ڈیورنٹ،"ہندوستان(ترجمہ:طیب رشید)"،تخلیقات،لاہور،1986ء۔
- یوسف سرمست،ڈاکٹر،"بیسویں صدی میں اردو ناول"،ترقی اردو بیورو، نئی دہلی،2000 ء۔

لغات:

- فرہنگِ عامرہ،الفیصل ناشران لاہور،2019 ء۔
- فرہنگِ آصفہ،الفیصل ناشران لاہور،2019 ء۔

ویب گاہیں:

- https://www.rekhta.org/
- https://www.punjnud.com/
- https://www.urdupoint.com/